ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

DECEMBER - 1987

Regd. No. 46065/86

Monthly Majallah Hayat-e-Nau

December - 1987 - BILARIAGANJ, AZAMGARH (U.P.)

طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح متوجہ ہوں

برادرِ عزیز!   السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ

امید ہے کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا چوتھا دو سالہ اجلاس انشاء اللہ ۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۱۹۸۸ء بروز جمعہ، سنیچر، اتوار، مادرِ علمی کے احاطے میں منعقد کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں:

۱۔ ابھی سے اجلاس میں شرکت کے لیے تیاری شروع کر دیں تاکہ عین وقت پر کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۲۔ اس دوران جس فلاحی بھائی سے بھی آپ کی ملاقات ہو سکے اس کو اجلاس میں شرکت پر ضرور آمادہ کریں، اور اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے شرکت پر آمادہ نہ ہو سکے تو پھر ہم کو اس کے پتہ کے ساتھ ضرور مطلع کریں۔

۳۔ ہمارے بہت سے فلاحی بھائی ہیں جن کے پتے ہمارے دفتر میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی ایک فہرست انشاء اللہ اگلے شمارہ میں اور پھر اخبار "دعوت" میں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان میں سے جس کسی کے بھی پتے کا آپ کو علم ہو ہمیں اس سے فوراً مطلع کریں تاکہ ہم کو ربط پیدا کرنے میں آسانی ہو سکے۔

۴۔ اجلاس کا پورا پروگرام اسی میں یا قریبی اشاعت میں دیا جا رہا ہے۔ جامعہ، انجمن "حیاتِ نو" کے لیے جو تجاویز و مشورے بھی آپ کے ذہن میں ہوں انھیں تحریر کر کے پہلے ہی ارسال کر دیں۔

۵۔ اجلاس کی کامیابی کے لیے خصوصی دعا کا اہتمام فرمائیں۔

والسلام

آپ کا بھائی — انصار احمد فلاحی

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۲ ________ شمارہ نمبر ۱۲

دسمبر ۱۹۸۷ء

- مدیر منتظم ________ نور محمد فلاحی
- مدیر ________ طارق فاروق طلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

سالانہ زرِ تعاون	۳۰ روپئے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپئے
غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
فی شمارہ	۳ روپئے

ترسیلِ زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلّہ حیاتِ نو۔ جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج، اعظم گڈھ۔ یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی ________ سے چھپوا کر کاتب: رفیق احمد شاہ پوری

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

ایک اور چراغ بجھ گیا	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳

بحث و نظر

مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل۔ ایک جائزہ۔ محمد رضی الاسلام ندوی		۶
اشیائے نشہ آور کا حکم	مولانا عبد الرؤف صاحب مبارکپوری	۳۳

مقالات

انّ الشرک لظلم عظیم	اسرار احمد خان	۲۲
تسخیر عالم کے لئے کمیونسٹ ہتھکنڈے	صباح الدین فلاحی	۳۷

عظمت کے مینار

حضرت ابو ایوب انصاریؓ	ابو جاوید۔ استاذ جامعہ	۴۰

شعر و نغمہ

غزلیں	شفیع اللہ خاں راز، عزیز گھوسوی، ابو الفیاض محمد	۳۲-۳۹
سوالات غزل	منصف مبارکپوری، شفیع اللہ خاں راز	۴۲

نشریات انجمن

کنونشن کے اہم پروگرام۔ ایک نظر میں	ناظم کنونشن	۳۱
رپورٹ اجلاس شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم	جاوید اشرف فلاحی سکریٹری انجمن	۳۰

تعارف و تبصرہ

بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان	محمد عمران خان فلاحی	۵۹

جامعہ کے لیل و نہار

ایڈیٹر حیاتِ نو کو الوداعی پارٹی	محمد اسماعیل فلاحی	۶۰

اداریہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

ایک اور چراغ بجھ گیا

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سیاسی برتری ہی کو قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال اور اقبال و ادبار کا اصل سبب سمجھ لیتے ہیں اور دینی و علمی تاریخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ سیاسی برتری یقیناً بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے لیکن تنہا اسی کو سب کچھ سمجھنا اور دوسرے حقائق سے آنکھیں موند لینا علم و تحقیق کی دنیا کی بات نہیں، بلکہ جہالت کا ایک فتنہ ہے۔ کسی بھی ملک یا قوم کی عزت و عظمت محض دولت اور اسباب و وسائل کی بہتات، صنعتی ترقیوں، عالیشان بنگلوں، فلک بوس ایوانوں اور سونے چاندی کے ڈھیروں سے وابستہ نہیں ہوتی۔ دیکھنے کی ایک اہم چیز یہ ہے کہ اس کے یہاں علم و تحقیق کا کیا حال ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ جمود اور تعطل کا دور دورہ اور جہالت کی گرم بازاری ہو۔ اگر کسی ملک سے علم کا جنازہ نکل چکا ہو اور اس پر جہالت کی حکمرانی ہو تو پھر نہ تو اس کی عظمت قائم ہو سکتی ہے اور نہ اس کا وقار ہی باقی رہ سکتا ہے۔ کسی بھی ملت کو پسماندہ بنانا اور اس سے روح حیات چھین لینی ہو تو اسے جہالت کے عمیق غاروں میں ڈھکیل دیجئے کہ پھر اس سے نکلنا نصیب نہ ہو۔

اسلام نے علم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ پہلی ہی وحی کے الفاظ ہیں:

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (العلق) قلم کے ذریعہ علم دیا۔

قرآن کریم رسول اکرمؐ کا ایک خاص فریضہ بتاتا ہے:

ویعلمہم الکتاب والحکمۃ۔ (الجمعۃ ۲) رسول انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

خود حضور اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے:

انما بعثت معلما۔ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

جنگ بدر میں قیدیوں کے فدیہ کی ایک شکل آپؐ نے یہ بھی رکھی تھی کہ وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں پہلے دن سے علم اور دین کی معیت رہی ہے۔

اور دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش رہے ہیں۔ ان میں کبھی انقطاع نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں کا دورِ عروج نہ صرف سیاسی حیثیت سے ممتاز ہے بلکہ علمی و تحقیقی پہلوؤں سے بھی دوسروں سے فائق و برتر دکھائی دیتا ہے۔ نہ صرف علمِ تفسیر و حدیث میں بلکہ علمِ افلاک، علمِ ہندسہ، علمِ طب اور علمِ ریاضی، کسی بھی علم میں کوئی ان کا حریف و مدمقابل مشکل ہی سے ملے گا۔

ہندوستان میں اسلام پہلی صدی ہجری ہی میں سندھ اور مالابار کے ساحل سے داخل ہو گیا تھا اور اسی وقت سے علم کی گرم بازاری بھی شروع ہو گئی تھی لیکن جب چنگیز خاں نے ۶۱۵ھ میں ماوراء النہر اور خراسان وغیرہ کو تاراج کر ڈالا، علماء و اساتذۂ علم و فن کو تہ تیغ کر دیا، کتب خانوں کو تہس نہس کر ڈالا اور اس طرح ۶۰۰ سالہ علمی ذخیرہ اغیار کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بن گیا تو بچے کچے محققین اور باکمال علماء و اساتذہ نے مصر اور ہندوستان کی راہ لی۔ دونوں جگہوں پر مملوک کی حکومتیں قائم تھیں۔ دونوں حکومتوں نے ان کی پذیرائی کی۔ اس طرح چنگیز کی چنگیزیت نے ہندوستان میں ایک بارگی بڑے بڑے اساطینِ علم اور ماہرینِ فن کو پہنچا دیا اور ان کی آمد سے علومِ دینیہ و دنیویہ دونوں کو بڑا فروغ ہوا۔ پورے آٹھ سو سالہ دورِ حکمرانی میں کوئی بھی ان کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ اسلام نے جہاں ہندوستان کو بہت کچھ عطا کیا وہیں علم و تحقیق کی روشنی بھی اسی کی دین ہے۔

آج جب پوزیشن بدل گئی ہے، سیاسی اقتدار ہاتھوں سے نکل چکا ہے اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی و تحقیقی انقطاع ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہوا۔ آج بھی باہر کی دنیا میں ہمارا علمی و تحقیقی وقار باقی ہے۔ شمعِ علم کے وہ پروانے قابلِ صد آفرین و مبارکباد ہیں، ہیروں و جواہرات میں تولے جانے کے لائق ہیں جنھوں نے علم و تحقیق کو اوڑھنا بچھونا بنایا ہے، جو علم کے پیاسے بلکہ دیوانے اور عاشق ہیں، جنھیں کسی صلہ اور داد و تحسین کی پروا اور تمغہ و ایوارڈ کی تمنا نہیں ہے، جو خونِ جگر جلا کر جہالت کی آندھیوں اور جمود کی ظلمتوں میں علم و تحقیق کی لو کو تیز سے تیز تر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم ناظم دار المصنفین، ایسے ہی لوگوں میں تھے جو ۱۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو لکھنؤ میں ایک موٹر کے حادثہ میں انتقال فرما گئے۔ اور ان کی یہ خبرِ انتقال تمام محبانِ علم و ادب پر بجلی بن کر گری۔ خدا انہیں غریقِ رحمت کرے، پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ادارے کو ان کا بہتر بدل مہیا کرے۔

یہ حادثہ کسی ایک فرد، ایک خاندان یا ایک ادارہ کا حادثہ نہیں پوری ملت کا حادثہ ہے۔ یہ خسارہ علم و تحقیق ہم سب کا خسارہ ہے۔ وہ گلستانِ شبلی اور بزمِ سلیمانی کے گل سرسبد تھے۔ انھوں نے علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی اور شاہ معین الدین ندوی کی علمی وراثت اور امانت کا حق ادا کر دیا۔ اس کی پوری پوری حفاظت فرمائی اور اس میں چار چاند لگائے۔ ان کے اندر تحقیق و جستجو کا ایک دریا موجزن تھا اور محنت و کاوش ان کا وطیرہ تھی جس پر ان کی پچاس سے زائد کتابیں اور بے شمار مقالات شاہد ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی تاریخ مسخ کرنے کی مذموم کوشش کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے۔ اس سے مرحوم کو بڑا فکر لگا ہوا تھا اور انھوں نے اس میں بڑا کام کیا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مسلمانوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

تصنع و تکلف سے دور، خلوص و محبت کا پیکر، ہمدردی و غم خواری کا مجسمہ اور علم و تحقیق کا یہ ستارہ بھی اپنے پیش رو ستاروں کی طرح ڈوب گیا۔ دنیا کا دستور ہے کہ اظہارِ غم کرتی اور آنسو بہاتی ہے۔ رسائل و اخبارات، ادارے اور مقالات لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق ادا ہو گیا لیکن آہ و بکا اور گریہ و ماتم کرنے سے کیا حاصل؟ زندہ قومیں آنسو بہانا نہیں جانتیں وہ تو تازہ حوصلے اور جوان عزم کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر اٹھتی اور ترقی کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ یقیناً ہماری آنکھیں نم، دل غمگین اور جذبات دکھی ہیں۔ لیکن ہم مایوس نہیں ہیں۔ ہم اپنے نوجوانوں کو پست ہمت اور بے حوصلہ نہیں سمجھتے۔ ہمیں ان سے پوری امید ہے کہ وہ علمی وقار کو مجروح نہیں ہونے دیں گے، اپنے اسلاف کی لاج رکھیں گے، ان کی روشن روایات کو ہر قیمت پر باقی رکھیں گے اور علم و تحقیق کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں گے، یہی خراجِ عقیدت کی بہترین شکل ہے۔

وقت کا مورخ قلم روکے انتظار میں کھڑا ہے کہ کتنے ہیں علم کے دیوانے جو سر سے کفن باندھ کر اٹھتے ہیں جنھیں اونچا جانا ہے، بہت اونچا!!!

..

جامعۃ الفلاح کے موذن نے "حی علی الفلاح" کی آواز اس زور سے لگا دی کہ نمازیوں کی کثرت سے شاید جامعہ کو تنگ دامنی کی شکایت کرنی پڑے۔

"سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ"

پہلی قسط

مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل

مولانا رضی الاسلام ندوی

ایک جائزہ

مولانا حمید الدین فراہیؒ عہد حاضر کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنھوں نے قرآن اور علوم قرآن پر عظیم الشان کام انجام دیا ہے اور تدبر قرآن کا نیا راستہ نکالا ہے۔ علوم قرآنی سے متعلق ان کے مختلف رسالے اور تفسیر نظام القرآن کے مختلف اجزاء شائع ہوکر قبول عام حاصل کرچکے ہیں۔ اس امتیازی خصوصیت کے باوجود ان کی تحریروں میں بعض خیالات ایسے ملتے ہیں جو قرآن کے طالب علم کو کھٹکتے ہیں، اس لئے کہ ان خیالات کے سلسلے میں وہ امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں منفرد ہیں۔ انھیں میں ایک وہ رائے بھی ہے جس کا اظہار انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں کیا ہے، وہ یہ کہ لشکر ابرہہ کا مقابلہ اہل مکہ نے کیا تھا اور پرندے ان پر سنگ باری کرنے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئے تھے۔ اگرچہ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر تدبر قرآن[1] میں یہی خیالات اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں لیکن علماء و مفسرین کے درمیان اس نظریہ کو مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن[2] میں اصحاب الفیل پر بحث کرتے ہوئے مشہور عام روایت ذکر کرنے کے بعد اس نظریہ کا سرسری تذکرہ کردیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی[3] اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ[4] نے اس پر متعدد اعتراضات کئے ہیں اور دلائل کے ساتھ اس کی غلطی واضح کی ہے۔ مولانا شبیر احمد صاحب ازہر میرٹھی مدرس جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ نے بھی اپنے ایک مضمون 'تفسیر سورۂ فیل' (شائع شدہ ماہنامہ ارشاد ماہ اکتوبر و نومبر ۱۹۸۵ء) میں جو ان کی زیر ترتیب تفسیر مفتاح القرآن کا حصہ ہے، اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ خیال تھا کہ ان بحثوں کے نتیجے میں مذکورہ رائے کی غلطی واضح ہوگئی ہے لیکن سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے شمارہ اپریل۔جون ۱۹۸۶ء میں

۱؎ تدبر قرآن جلد ہشتم ص ۵۶۰ – ۵۶۶ فاران پاکستان ۲؎ ارض القرآن اول ص ۵۱ – ۳۲۰ دار المصنفین اعظم گڑھ طبع چہارم ۱۹۵۵ء ۳؎ قصص القرآن سوم بحث اصحاب الفیل، ندوۃ المصنفین دہلی ۴؎ تفہیم القرآن ششم تفسیر سورۂ فیل، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

جناب نسیم ظہیر صاحب اصلاحی کا ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں مولانا میرٹھی کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مولانا فراہی کی رائے کی تائید کی گئی ہے۔ ان کا جائزہ جیسا کچھ ہے اس پر بحث مقالہ میں آگے آئے گی لیکن چونکہ ان تمام مناقشات و مباحثات کی بنیاد مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل ہے اس لئے ہم براہ راست اسی کا جائزہ لیں گے اور اس کے ساتھ ہی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور جناب نسیم ظہیر صاحب اصلاحی کے استدلالات پر بھی گفتگو کریں گے۔

مولانا فراہی کا طریقۂ تفسیر

مولانا فراہی کے نزدیک بنیادی ماخذ صرف قرآن ہے۔ حدیث کو فرع کی حیثیت حاصل ہے اس لئے ان کے نزدیک تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن میں تدبر کیا جائے اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق اور نظم سے اس کا مفہوم سمجھا جائے پھر جو مفہوم سمجھ میں آیا ہو اس پر حدیث کو پرکھا جائے۔ اگر حدیث سے بھی وہ مفہوم معلوم ہوتا ہو تو حدیث کو قبول کرلیا جائے ورنہ وہ مفہوم اختیار کرلیا جائے اور حدیث کے معاملہ میں توقف اختیار کیا جائے۔

"شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہئے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کردیں۔ سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شان نزول ہے جو خود نظم قرآن سے مترشح ہورہی ہو۔"[1]

یہی طریقہ انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں بھی اپنایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"مفسرین عموماً قصہ کی تمام تفصیلات روایات سے اخذ کرتے ہیں اور ضعیف و قوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل منفرد اور عموماً صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ واقعہ کی اصلی شکل روایات سے بالکل الگ کرکے دیکھی جائے اس کے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور غلط روایات کو صحیح روایات سے چھانٹ کر الگ کیا جائے۔"[2]

قرآن میں تدبر ضروری ہے لیکن روایات کو پس پشت ڈال کر صرف عقل کا سہارا لینا اور روایات کو عقلی معیار پر پرکھنا یا آنے والے مفہوم پر پرکھنا بھی حد اعتدال سے تجاوز ہے۔ ایک تاریخی واقعہ کے سلسلے میں صحیح روایات کے ساتھ ساتھ ضعیف اور مبالغہ آمیز روایات ہونے کا امکان ہے لیکن اس کی وجہ سے

۱؎ مولانا فراہی: مقدمہ نظام القرآن ص ۲۶ – ۲۷، ترجمہ از مولانا امین احسن اصلاحی طبع اول دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ۔ ۲؎ ایضاً تفسیر سورۂ فیل ص ۲۲۔

تمام روایتوں کو بے بنیاد اور خود ساختہ قرار دینا صحیح نہیں۔

مشہور عام روایت پر شبہ

(۱) روایت کی سند کے بارے میں مولانا فراہی نے لکھا ہے:

"جو حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں سب یک قلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق پر ختم ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔" [6]

نسیم اصلاحی صاحب نے بھی ابن حجر کی تہذیب التہذیب سے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جیسے امام مالکؒ کا قول "محمد بن اسحاق دجال ہے" امام بخاریؒ کا قول "محمد بن اسحٰق ایک ہزار حدیثوں میں منفرد ہے" ابن نمیر کا قول "مجہول لوگوں سے بے بنیاد روایات نقل کرتے ہیں" احمد بن حنبل کا قول "محمد بن اسحاق تدلیس کرتے ہیں" وغیرہ۔ پھر حاشیہ میں لکھا ہے کہ "امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث انھیں بالکل ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔" [7]

لیکن ان تمام اقوال کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ امام مالکؒ کے قول کا ایک خاص پس منظر ہے۔ مدینہ میں ابن اسحٰق سے بڑھ کر علم الانساب جاننے والا کوئی نہ تھا۔ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ امام مالک ذی اصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں جب کہ امام مالک اپنے آپ کو حمیری شاخ اصبح میں سے سمجھتے تھے اسی وجہ سے دونوں میں منافرت تھی۔ جب امام مالکؒ نے موطا تصنیف کی تو ابن اسحاق نے کہا "ایتونی بہ فانا بیطارہ" (اسے میرے پاس لاؤ اس کا ناقد تو میں ہوں) یہ بات امام مالک کو معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا "ھذا دجال من الدجاجلۃ یروی عن الیہود" (یہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے۔ یہودیوں سے روایات نقل کرتا ہے)۔

"امام مالک حدیث کی وجہ سے ابن اسحاق پر عیب نہیں لگاتے تھے بلکہ وہ اس لئے ان کا انکار کرتے تھے کہ وہ غزوات نبوی سے متعلق یہودیوں کی ان اولادوں کی روایات نقل کرتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے اور جنھیں خیبر، قریظہ اور نضیر کی جنگوں کے حالات اور اپنے آبا و اجداد کے متعلق اس طرح کے عجیب و غریب

---

[6] ایضاً، ص ۲۵۔ [7] سہ ماہی تحقیقات اسلامی شمارہ اپریل ا جون ۱۹۸۶ء ص ۶۲—۶۳۔

واقعات یاد تھے۔ ابن اسحاق یہ روایات معلوم کرنے کے لئے ان کا تتبع کرتے تھے اور اس بات کا التزام نہ کرتے تھے کہ وہ قابل اعتماد بھی ہیں۔" [8]

ان پر ایک بڑا اعتراض تدلیس کا بھی ہے لیکن کسی کا مدلس ہونا اس کی تضعیف کے لئے کافی نہیں ہے۔ زہری بھی تدلیس کرتے تھے اور ان سے پہلے عروہ بھی تدلیس کرتے تھے لیکن کسی نے ان کو مطعون نہیں کیا بلکہ خود امام احمد بن حنبل نے تدلیس کے باوجود عروہ کی روایت قبول کی ہیں در اصل "یہ اسلوب اس فرق سے تعلق ہے جو حدیث اور تاریخ کے درمیان موجود ہے۔ حدیث میں ہر واقعہ مطلوب نہیں ہوتا بلکہ بیان کردہ واقعات کی صداقت کے بارے میں ہر گروہ کی گواہی مطلوب ہوتی ہے۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس کا انحصار حدیث پر ہے لیکن اس کی غرض یہ ہے کہ تاریخی حکایت کے متعلق ایک مکمل اور مربوط قصہ کے طور پر خبر ہم پہنچائی جائے بغیر اس کے کہ کلام کی ساخت اور بیانات کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کئے جائیں۔" [9]

ابن اسحاق کو مطعون کرنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے ان کی توثیق کی ہے شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید، حماد بن زید، حماد بن سلمہ جیسے عظیم محدثین نے ان سے روایت کی ہے۔ [10]

نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ان کی روایات موجود ہیں۔ [11] جس شخص کو متعدد محدثین نے ثقہ قرار دیا ہو اور جس کی روایات (صحیح بخاری کے علاوہ) صحاح ستہ میں موجود ہوں۔ اس کی روایت کو محض چند لوگوں کی تضعیف کی وجہ سے (وہ بھی ایک مخصوص پس منظر میں) ناقابل اعتبار قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اس سلسلہ میں عصر حاضر کے مشہور محقق علامہ شبلی نعمانی کی رائے ملاحظہ ہو:

"محمد بن اسحاق تابعی ہیں۔ ایک صحابی حضرت انس کو دیکھا تھا علم حدیث میں کمال تھا۔۔۔۔ ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں لی لیکن جزء القراۃ میں ان سے روایت لی ہے۔ تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لئے ہیں۔

---

[8] نقوش رسول نمبر جلد ۱۱ مقدمہ سیرت ابن اسحاق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ص ۲۰۰۔ [9] ایضاً ص ۲۰۳۔ [10] ایضاً ص ۲۸۶ بحوالہ جامع بیان العلم اکبر، فی معرفۃ الرجال مخطوطہ برلین۔ [11] مقدمہ سیرت ابن ہشام از محققین احیاء التراث العربی بیروت لبنان ص ۲۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور چونکہ یہ واقعات انھوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا۔[۱۳]

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ روایت صرف محمد بن اسحاق کے واسطے سے مروی ہے اس لئے کہ روایت کے بعض اجزاء دوسرے راویوں جیسے قتادہ، عبید بن عمر، ابن عباس، سعید بن جبیر وغیرہ سے بھی مروی ہیں اور ان میں چڑیوں کے بصراحت سنگباری کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔ پھر یہ کہ اگر ہم یوں ہی ایک دو اقوال کی روشنی میں راویوں کو مطعون اور ناقابل اعتبار قرار دینا شروع کر دیں تو امام ابو حنیفہ اور امام شافعی جیسے بزرگ نقہا بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچ سکیں گے۔ اس لئے کہ متعدد لوگوں نے ان پر بھی نقد و جرح کیا ہے۔

عجیب بات تو یہ کہ ایک طرف مولانا فراہی روایت کو محض ابن اسحاق کی وجہ سے ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں دوسری طرف خود اسی روایت میں موجود اشعار پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں جبکہ ابن اسحاق کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انھیں اشعار گھڑ گھڑ کر پیش کئے جاتے تھے۔

(ب) مولانا فراہی نے واقعۂ فیل کے سلسلے میں مشہور عام روایت پر مختلف عقلی شبہات وارد کر کے اسے بے بنیاد لغو اور غلط قرار دیا ہے۔ ذیل میں انھیں شبہات کا جائزہ لیا جائے گا۔

(۱) پہلا شبہ یہ ہے کہ "روایت میں ہے کہ قریش کے سردار عبد المطلب خدا کے گھر کی حفاظت کے لئے مقابلہ آرائی کے بجائے پہاڑوں میں جا چھپے حالانکہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو بغیر مدافعت کے اپنا معبد دشمنوں کے حوالے کر کے پہاڑوں میں جا چھپے۔"

(۲) دوسرا شبہ یہ ہے کہ "روایت میں ہے کہ عبد المطلب ابرہہ سے ملنے گئے تو وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اس سے پوری امید بندھتی ہے کہ اگر وہ اس سے خانہ کعبہ کے بارے میں کوئی خواہش کرتے تو وہ اس کو آسانی سے رد نہ کرتا۔ ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چند اونٹوں کے لئے تو اس سے درخواست کرتے اور اصل معاملہ کو بالکل ٹال دیتے۔"

روایت کا مطالعہ کرنے سے یہ دونوں شبہے بے بنیاد ثابت ہوتے ہیں۔ ابن اسحاق ہی کی

---

[۱۳] مولانا شبلی نعمانی سیرت النبی اول ص ۲۲۳ – ۲۲۴ دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء۔

روایت میں یہ بھی ہے کہ "بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابرہہ سے ملنے عبد المطلب کے ساتھ بنو بکر کے سردار یعمر نفاثہ اور ہذیل کے سردار خویلد بن واثلہ بھی گئے تھے۔ انھوں نے ابرہہ سے کہا کہ وہ تہامہ کا ایک تہائی مال لے اور خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ارادہ ترک کر کے واپس چلا جائے۔ لیکن اس نے انکار کیا۔"[۱۴]

خود ابن اسحاق نے اپنی سیرت[۱۵] میں عبد المطلب کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبد المطلب نے ابرہہ کو اس کے ارادے سے باز رکھنے اور واپس کرنے کی کوشش کی تھی

منعت ابرهة الارض التی حمیت	من اللئام فلم تخلق لهم دارا
منعت مکة منهم إلى سراجل	ذو أسرة لم یکن فی الحب غدارا
إذ قلت یا صاحب الحبشان إن لنا	من دون أن یهدم المعمور اخطارا
فصار فی حبشه بالفیل مقتدرا	وسرت مستبسلا للموت صابرا
فی فتیة من قریش لیس میتهم	بمورث حیهم شینا ولا عارا[۱۶]

(تو نے ابرہہ کو اس زمین سے روک دیا جو ایسے کمینوں کی دست برد سے محفوظ ہے جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تو نے ان حملہ آوروں سے اہل مکہ کی حفاظت کرائی بے شک میں صاحب قبیلہ ہوں اور محبت میں غداری و بد عہدی کرنے والا نہیں ہوں۔ جب میں نے اس سے کہا اے حبشیوں کے سردار اگر خانہ کعبہ منہدم ہو جائے تو ہمارے لئے اس میں خطرات ہیں وہ اپنے لشکر میں ہاتھی کے ساتھ صاحب اقتدار تھا اور میں صبر کے ساتھ مرنے کے لئے تیار ہو گیا میرے ساتھ قریش کے ایسے نوجوان تھے جو جان کی قربانی دے کر زندہ رہنے والوں کے لئے ذلت اور عار نہیں چھوڑتے)

ان اشعار سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبد المطلب نے ابرہہ کو باز رکھنے کی کوشش کی تھی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انکار کر دینے پر مقابلہ آرائی کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے لیکن نتائج ان کے سامنے تھے۔ ابرہہ کے لشکر جرار سے مقابلہ ناممکن تھا۔ راستے میں جن قبائل نے مقابلہ کی کوشش کی تھی وہ ہزیمت اٹھا کر قتل اور قید کر دیئے گئے تھے۔ اس سے اہل مکہ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ابرہہ کے لشکر کا

---

[۱۴] ابن ہشام ق ۱ ص ۵۲۔ [۱۵] ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سیرت ابن اسحاق تحقیق کر کے شائع کی ہے اس کا اردو ترجمہ نقوش رسول نمبر گیارہویں جلد میں شامل ہے۔ [۱۶] نقوش رسول نمبر جلد ۱۱ ص ۵۹۔

مقابلہ کرتا ان کے بس میں نہیں۔ سیرت ابن ہشام میں ہے:

"فهمت قريش وكنانة وهذيل ومن كان بذلك الحرم من سائر الناس لقتاله ثم عرفوا أنهم لا طاقة لهم به فتركوا ذلك" [۱۷]

(قریش، کنانہ، ہذیل اور جو لوگ اس وقت حرم میں موجود تھے انھوں نے ابرہہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا پھر انھیں اندازہ ہو گیا کہ ان میں اس سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا)

اس صورت میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش کر لشکر ابرہہ کو تباہ و برباد کر دیا۔

(۳) تیسرا شبہ یہ ہے کہ ابن سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کے حملے کے پہلے دن سے قبائل عرب اس کی فوج پر آفت کرتے رہتے تھے۔ ذو الرمہ کہتا ہے:

وابرهة اصطادت صدور رماحنا — جهارا وعثنون العجاجة أكدر
تنحى له عمرو فشك ضلوعه — بنافذة عجلاء والخيل تضبر

(ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا عمرو نے اس کی طرف لپک کر نیزے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم ہیں)

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اس قدر مرعوب ہو جائیں کہ بالکل مقابلہ نہ کریں۔

مولانا فراہی نے ان اشعار کی تشریح میں لکھا ہے کہ "ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ ذو الرمہ کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا کثیف غبار آسمان تک بلند تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیج کر ان پر سنگریزوں کی بارش کی۔" [۱۸]

اس تشریح میں مولانا سے تسامح ہو گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ واقعہ جس دن پیش آیا اسی دن اللہ تعالیٰ نے سنگباری کے ذریعے لشکر ابرہہ کو ہلاک کیا حالانکہ صحیح یہ ہے کہ شاعر نے ان اشعار میں لشکر ابرہہ سے پہلے ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر یہاں مرد کا

---

۱۷ ابن ہشام اول ص ۵۰ ۔ ۱۸ تفسیر سورۂ فیل ص ۴۸

رہنے والا ہے، دوسرے یہ کہ خود ان کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابرہہ سے نیزوں کے ذریعے آمنے سامنے مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں پر جا کر مقابلہ کیا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں میں چلے گئے تھے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ مدافعت سے کلیتہً دست بردار ہو کر پہاڑوں میں جا چھپے تھے بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کر سکتے تھے یہی تھی اسی وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی ...... ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تھا اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صف بندی کر کے تلوار و نیزے کے ذریعہ سے کرنا قریش کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور و اثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس ہزار سے زیادہ آدمی اکٹھے نہ کر پاتے اس وجہ سے انھوں نے اپنے لئے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہو جائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقے پر جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہیں کریں۔" [۱۹]

قریش کے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہونے والی جھڑپوں کے نتائج سے وہ واقف تھے انھیں سوائے اللہ کی غیبی مدد کے کسی سہارے کی امید نہیں تھی اس لئے مقابلہ کی تیاریوں کے بجائے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا و مناجات اور تضرع و ابتہال کرتے ہوئے پہاڑیوں میں چلے گئے۔

(۴) مولانا فراہی نے لکھا ہے کہ "علمائے سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کا حملہ موسم حج میں ہوا تھا" اور دلیل میں علامہ ابن ہشام کا یہ شعر نقل کیا ہے:

لاهم اخز الاسود بن مقصود — الآخذ الهجمة فيها التقليد

(خداوندا! اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے ہانک لے گیا)

جہاں تک علمائے سیر کا تعلق ہے ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ انھوں نے ابرہہ کے حملے کا وقت موسم حج بتلایا ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود ہمیں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے موسم حج میں ابرہہ کے حملے کا اشارہ ملتا ہو۔ اس کا اعتراف نسیم صدیقی صاحب نے بھی کیا ہے۔ [۲۰] تاریخ و سیر کی متداول [illegible]

---

۱۹ تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، ہشتم ص ۵۶۱ ۔ ۵۶۲ ۔ ۲۰ تحقیقات اسلامی ص ۶۲ ۔ ۶۳

میں جب ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی جس سے موسم حج میں حملہ ابرہہ کا پتہ چلتا ہو تو محض نکتہ آفرینی علمی تحقیقات میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔ واقعۂ فیل کے زمانے کے بارے میں بہت سے مختلف اقوال ملتے ہیں لیکن مشہور قول یہ ہے کہ اسی سال حضور ﷺ کی ولادت ہوئی۔ مشہور قول کے مطابق حضور کی ولادت کے پچاس دن قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نسیم اصلاحی صاحب کو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جن روایتوں میں واقعہ فیل کا زمانہ محرم بتایا گیا ہے ان کا ماخذ صرف محمد بن اسحاق کی بیان کردہ روایت ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے راویوں کی تصریحات ملتی ہیں۔ چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابو جعفر باقر سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ محرم کا ہے اور اگر ان روایتوں کا ماخذ صرف محمد بن اسحٰق ہی ہوتے تو بھی اسے ناقابل اعتبار نہیں قرار دیا جا سکتا اس لئے کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ تاریخ و سیر میں تمام علماء کے نزدیک محمد بن اسحاق معتبر ہیں۔

نسیم اصلاحی صاحب نے ایک اور استدلال ابن اسحاق کی روایت "وهمت قريش وكنانة ومن كان معهم بالحرم من سائر الناس" میں "من سائر الناس" کے الفاظ سے یہ کیا ہے کہ "جب حج ختم ہو چکا تھا تو حرم میں پھر کون لوگ رہ گئے تھے، ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حجاج ہی تھے"[۲۱] لیکن یہ انتہائی مہمل اعتراض ہے۔ ظاہر ہے کہ حرم کبھی لوگوں سے خالی نہیں ہوتا ہر وقت لوگ طواف و عبادات میں مصروف رہتے تھے۔ محض "من سائر الناس" کے الفاظ سے یہ استدلال کرنا کہ یہ حج کا زمانہ تھا مضحکہ خیز ہے۔ مزید حیرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ایک طرف نسیم صاحب اس روایت کو ابن اسحاق کی قرار دے کر ناقابل استناد قرار دیتے ہیں دوسری جانب خود اس سے استدلال کرتے ہیں اور اس سے آگے کی عبارت "ثم عرفوا انهم لا طاقة لهم به فتركوا ذلك" چونکہ ان کے خلاف پڑتی ہے اس لئے اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

مولانا فراہی کا استدلال صرف عکرمہ کے مذکورہ شعر سے ہے جبکہ اس شعر سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسود بن مقصود جو اونٹ ہنکا لے گیا تھا ان کے گلوں میں قلادے تھے۔ قلادہ صرف اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ اونٹ کو قربانی کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام اونٹوں کو ایک ہی سال قربان کر دیا جائے۔

---

۲۱ ایضاً ص ۴۳

تاریخ طبری میں ابن عباس سے مروی ایک روایت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے جب عبد المطلب کے اونٹ واپس کر دیئے تو انھوں نے ان کی گردنوں میں جوتوں کے قلادے پہنا کر اور ان کا اشعار کر کے ہدی بنا دیا اور حرم میں منتشر کر دیا تاکہ انھیں کوئی گزند پہنچے تو رب حرم کا غضب بھڑک اٹھے۔ "فأمر برد ابله عليه، فلما قبضها قلدها النعال، وأشعرها وجعلها هدايا، وبثها في الحرم لكي يصاب منها شيء فيغضب رب الحرم"[۲۲]

ممکن ہے شاعر نے اسی بات کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو۔

(۵) مولانا نے لکھا ہے کہ عرب شعراء نے قبیلۂ ثقیف کی ہجو کی ہے کیونکہ انھوں نے کعبہ کی حمیت کے وقت بزدلی دکھائی۔ اہل عرب ابو رغال ثقفی کی قبر پر سنگساری کرتے رہے کیونکہ اس نے ابرہہ کی فوج کو راستہ بتایا تھا۔ اگر ثقیف کی طرح عرب بھی بھاگ گئے تھے تو ثقیف ہی کا کیا قصور تھا کہ ان کی ہجو کی گئی۔

لیکن دونوں صورتوں میں بیّن فرق ہے۔ قبیلۂ ثقیف کو جب ابرہہ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے بت کدے کو بچانے کے لئے اس کی خدمت میں جا کر عرض کیا کہ لات کا یہ بتکدہ وہ نہیں جسے ڈھانے کے لئے آپ آئے ہیں بلکہ وہ مکہ میں ہے۔ انھوں نے صرف راستہ بتانے پر اکتفا نہ کی بلکہ ابو رغال نامی ایک شخص کو ان کی رہنمائی کے لئے ساتھ کر دیا۔ اس کے برخلاف اہل مکہ نے ابرہہ کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی جب وہ نہ مانا تو چونکہ وہ اس سے دفاع کی طاقت نہ رکھتے تھے، اس لئے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا۔

(۶) مولانا فراہی نے کید کی یہ تشریح کی ہے:

"قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب الفیل نے ایک مخفی چال چلی تھی لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں مخفی چال کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ اس کے برعکس قوت نمائش اور عربوں کی تذلیل کی ایک نہایت کھلی ہوئی کارروائی ہے۔ البتہ قابل اعتماد روایات

---

۲۲ تاریخ الامم والملوک طبری جلد ۲ ص ۱۱۴۔

سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی چال) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں مثلاً:

۱۔ اس نے احترام کے مہینوں میں حملہ کیا کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خونریزی سے احتراز کرتے ہیں۔

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔

۳۔ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس ہو رہے ہوں گے۔[۲۳]

کید کا ترجمہ "مخفی چال" محل نظر ہے۔ لغت میں اس کے ایک معنی مطلق تدبیر کے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لسان العرب میں ہے "الکید التدبیر بباطل أو بحق"[۲۴] قرآن میں بھی کید کا استعمال خفیہ چال کے لئے خاص نہیں ہے بلکہ کبھی مطلق تدبیر کے معنی میں آیا ہے جیسے درج ذیل آیت میں:

من کان یظن أن لن ینصره اللہ فی الدنیا والآخرة فلیمدد بسبب إلی السماء ثم لیقطع فلینظر هل یذهبن کیده ما یغیظ۔ (الحج۔ ۱۵)

(جو شخص گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا اسے چاہئے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے پھر دیکھے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو دور کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے)

اور کبھی بری تدبیر کے معنی میں آتا ہے خواہ علانیہ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کے خلاف ان کی قوم کی سازشیں ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ انھوں نے علانیہ معبودوں کی دہائی دے کر حضرت ابراہیمؑ کو آگ کے الاؤ میں جھونک دینے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن قرآن نے اس کے لئے بھی کید کا لفظ استعمال کیا:

قالوا ابنوا له بنیانا فألقوه فی الجحیم۔ فأرادوا به کیدا فجعلناهم الأسفلین۔ (الصافات ۔ ۹۷، ۹۸)

قالوا حرقوه وانصروا آلهتکم إن کنتم فاعلین۔ قلنا یا نار کونی بردا وسلاما علی إبراهیم۔ وأرادوا به کیدا فجعلناهم الأخسرین۔ (الانبیاء ۔ ۶۸-۷۰)

---

۲۳ تفسیر سورۂ فیل ص ۱۵۱۔ ۲۴ لسان العرب ۳/۳۸۹ مادہ "کید"۔

اور اگر کید کے معنی خفیہ چال کے مان بھی لیں تب بھی مولانا فراہی کی مذکورہ تشریح صحیح نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ ہرگز ثابت نہیں کہ ابرہہ کا حملہ موسم حج میں نہیں بلکہ محرم کے مہینے میں ہوا تھا۔ ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے "قلیس" نامی گرجا کو تیار کرایا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس گرجا کا حج کریں۔ اسی اثناء میں کسی عرب نے گرجا کو گندا کر دیا۔ ممکن ہے خود اس نے سازش کر کے گندا کروا دیا ہو اور عربوں کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ بہر حال اس طرح اس نے ظاہر میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ایک بہانہ تلاش کر لیا ورنہ وہ دل میں بہر صورت اسے ڈھانے کا عزم رکھتا تھا۔ فخر رازی نے بھی کید کی یہی تشریح کی ہے[۲۵] جو اطمینان بخش ہے۔

کلام عرب سے استشہاد

(۱) مولانا فراہی نے دسویں فصل کا عنوان یہ قائم کیا ہے "کلام عرب کی شہادت کہ سنگباری آسمان اور ہوا سے ہوئی" اور اس میں سات آٹھ شعراء کے اشعار نقل کئے ہیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ بیشتر اشعار میں سنگباری کا کوئی تذکرہ نہیں۔ جن اشعار سے کسی نہ کسی صورت میں استدلال کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں:

فأرسل من ربهم حاصب	یلفهم مثل لف القزم (ابو قیس)
فلما أجازوا بطن نعمان ردهم	جنود الإله بین ساف وحاصب (الاقرم)
حمدت الله إذ عاینت طیرا	وحصب حجارة تلقى علینا (نفیل خثعمی)

پہلے دو اشعار میں "حاصب" اور "ساف" کے الفاظ ہیں۔ انھی سے انھوں نے استدلال کیا ہے کہ "عربی میں حاصب اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکر اور سنگ ریزے اڑا کر پھینکتی ہے اور سافی اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس و خاشاک اور درختوں کی پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے۔"

دوسرے شعر کا ترجمہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے یہ کیا ہے: "جب وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے تو خدا کی فوجوں نے سافی اور حاصب کی شکل میں نمودار ہو کر ان کو پسپا کر دیا۔"[۲۶]

یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ خود انھوں نے اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں اس شعر کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بالکل صحیح

---

۲۵ تفسیر کبیر رازی ۳۲/۹۶ دار احیاء التراث العربی

۲۶ تفسیر سورۂ فیل ص ۶۳

ہے: "جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کے درمیان نمودار ہو کر انھیں پسپا کر دیا۔" [۲۷]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی فوج جس نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا وہ ساف اور حاصب کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ان فوجوں نے لشکر کو اس حال میں پسپا کیا جب تیز و تند ہوا بھی چل رہی تھی۔ وہ خدائی فوج کیا تھی، روایتوں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

تیسرا شعر مختلف کتابوں میں کچھ الفاظ کے اختلاف سے مذکور ہے جیسے سیرت ابن ہشام میں ہے:

حمدت اللہ اذ ابصرت طیراً — وخفت حجارۃ تلقی علینا

(میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب پرندوں کو دیکھا، اور میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آ پڑیں)

سیرت ابن اسحٰق میں ہے:

خشیت اللہ لما رأیت طیرا — وظننت حجارۃ ترمی علینا

(میں اللہ سے ڈرا جب میں نے پرندوں کو دیکھا، اس وقت ہمارے اوپر پتھر پھینکے جا رہے تھے)

تمام اشعار نقل کرنے کے بعد مولانا فراہی نے لکھا ہے: "ان اشعار کو غور سے پڑھو۔ یہ لوگ جو واقعے کے عینی شاہد ہیں چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے بلکہ اس سنگباری کو حاصب اور ساف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔" [۲۸]

پہلے دو شعروں میں وضاحت گزری کہ شاعر نے لشکر کو پسپا کرنے کی نسبت ساف اور حاصب کی طرف نہیں بلکہ "جنود الالٰہ" کی طرف کی ہے۔ تیسرے شعر میں شاعر چڑیوں اور سنگباری کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چڑیاں ہی سنگباری کر رہی تھیں۔ شعر کا جو انداز ہے وہ بھی اسی بات کی تائید کرتا ہے۔ مولانا فراہی نے خود لکھا ہے کہ "شعراء کا عام انداز کلام اجمال و کنایہ کا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے۔" شاعر کہتا ہے کہ میں نے چڑیوں کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور اس وقت مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں پتھر ہمارے اوپر بھی نہ آ گریں۔ چڑیوں کو دیکھتے ہی اللہ کا شکر ادا کرنے اور اپنے اوپر پتھر گرنے کا خوف کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟

[۲۷] تدبر قرآن ہشتم ص ۵۸۱ ـ [۲۸] تفسیر سورۂ فیل ص ۶۶

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے چڑیوں کو سنگباری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ایسا بھی نہیں کہ کسی شاعر نے بصراحت چڑیوں کے پتھر پھینکنے کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن قیس الرقیات کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں بصراحت چڑیوں کی سنگباری کا تذکرہ ہے:

"کادہ الاشرم الذی جاء بالفیل — فولّی وجیشہ مہزوم

واستہلت علیہم الطیر بالجندل حتی کانہ مرجوم

ذاک من یغزہ من الناس یرجع — وہو فل من الجیوش ذمیم" [۲۹]

(اس کے خلاف اشرم نے سازش کی جو ہاتھی لے کر آیا مگر اسے پیٹھ پھیر کر بھاگنا پڑا اور اس کا لشکر شکست کھا کر رہا اور اس پر چڑیاں کنکر پتھر لے کر چھا گئیں یہاں تک کہ وہ سنگسار کیے ہوئے شخص کی طرح ہو گیا۔ یہی حشر ہر اس شخص کا ہوگا جو اس سے آمادۂ جنگ ہوگا کہ وہ شکست خوردہ اور ملامت زدہ ہو کر واپس ہوئے گا۔)

یہ اشعار سیرت ابن ہشام میں موجود ہیں جو مولانا فراہی کی نظر سے ضرور گزرے ہوں گے لیکن معلوم نہیں کیوں مولانا نے انھیں لائق اعتنا نہیں سمجھا۔

اسی فصل میں آگے مولانا فراہی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چڑیاں لاشیں کھانے کیلئے آئی تھیں۔ لکھتے ہیں: "شعراء کا عام انداز کلام اجمال و کنایہ کا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے۔ بعض نے محض چڑیوں کے دیکھنے کا ذکر کر دیا ہے اور اس قدر بس تھا کیونکہ قتل گاہوں اور جنگ کے میدانوں میں گوشت خور چڑیوں کا جمع ہونا عربوں میں ایک معلوم و مشہور بات تھی۔ وہ فوج کے ساتھ چڑیوں کے جھنڈ دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے کہ لڑائی ضرور ہوگی۔ اصحاب ذبیہ کے قتل کی پیشین گوئی عمرو بن امیہ نے اسی دلیل سے کی تھی۔ بعض شعراء فوجوں کے ذکر کے ساتھ چڑیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ چڑیوں کو اندازہ ہو گیا ہے کہ میدان جنگ میں بے شمار لاشیں ملیں گی اس وجہ سے وہ بھی ساتھ ہو لی ہیں۔ مشہور شاعر نابغہ، عمرو بن حارث غسانی اور اس کی قوم کا ذکر کرتا ہے:

اذا ما غزوا بالجیش حلق فوقہم — عصائب طیر تہتدی بعصائب

[۲۹] ابن ہشام اوّل ص ۶۲

جوانح قد ایقن ان قبیله   اذا ما التقی الجمعان اول غالب

(جب وہ فوج لے کر حملہ کرتے ہیں تو چڑیوں کے جھنڈ کے جھنڈ اُن کے اوپر منڈلاتے رہتے ہیں۔ وہ اڑ جاتی تھیں کیونکہ ان کو یقین ہے کہ جب دو جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوتی ہے تو انہی کا قبیلہ غالب رہتا ہے)۔ اسی مضمون کو ابو نواس نے لیا ہے:

تتأی الطیر غدوته   ثقة بالشبع من جزره

(جب میرا ممدوح جنگ کے لئے نکلتا ہے تو چڑیوں کے جھنڈ اس کے پیچھے اس یقین کے ساتھ چلتے ہیں کہ اسکے شکار سے اپنا پیٹ خوب بھر لیں گی) [۱]

مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہیؒ کے اس استدلال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"۳۶ھ میں بصرہ میں جنگ جمل واقع ہوئی تھی۔ حجاز میں اس لڑائی کا حال اسی دن معلوم ہوگیا تھا کیونکہ غول در غول پرندے کٹے ہوئے اعضاء چنگلوں اور چونچوں میں لئے ہوئے ادھر اُدھر اڑ رہے تھے۔" [۲]

مذکورہ شعر میں شاعرانہ مبالغہ آرائی ظاہر ہے۔ شاعر اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب وہ لشکر لیکر جنگ کیلئے چلتا ہے تو پرندوں کے جھنڈ اس یقین کے ساتھ اسکے ساتھ ہو لیتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوگا تو اسکے شکار سے اپنا پیٹ بھرینگے۔ پرندوں کا شکی کامیابی کا یقین کیا حقیقتہً تذکرہ ہوسکتا ہے؟ اس مبالغہ آرائی کو حقیقت واقعہ بنا کر استدلال صحیح نہیں ہوسکتا۔

واقعہ فیل سے قبل بھی ایام جاہلیت میں بہت سی جنگیں ہو چکی تھیں جیسے جنگ بسوس، جنگ داحس وغبراء، جنگ بعاث وغیرہ جن میں ہزاروں جانیں ضائع ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد بھی بے شمار جنگیں ہوئیں اور تاریخ میں ان جنگوں کی جزئیات تک محفوظ ہیں لیکن کسی جنگ کے بارے میں یہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے اس موقع پر آنے والے مردار خور پرندوں کا تذکرہ کیا ہو اور ان کی شکل و صورت، رنگ اور قد وغیرہ کا تحقیق و باریکی سے تذکرہ کیا ہو۔ اگر جنگ کے موقع پر چڑیوں کا آنا ایک معمول تھا اور واقعہ بھی تھا تو اسے اتنی اہمیت دینے اور ان کی شکل و صورت، رنگ، چونچ کی ہیئت، اور قد وغیرہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ روایتوں کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ فیل کے موقع پر ضرور کوئی غیر معمولی اور خلاف معمول بات پیش آئی تھی اسی لئے راویوں نے اہمیت دے کر چڑیوں کا تذکرہ کیا۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل ص ۶۸-۶۹ [۲] ارض القرآن سید سلیمان ندوی اول ص ۲۱۵ بحوالہ تاریخ طبری ذکر واقعہ جمل

کنونشن انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ منعقدہ بتاریخ ۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۸۵ء کے اہم پروگرام

ایک مختصر خاکہ

پہلا اجلاس:- ۱۲ فروری ۸۵ء بعد نماز جمعہ ۲ بجے تا نماز عصر۔

تلاوت کلام پاک، ترانہ جامعہ، افتتاحی کلمات، خطبہ استقبالیہ، خطبہ صدارت، رپورٹ انجمن، باہمی تعارف

دوسرا اجلاس:- بعد نماز عشاء۔ (تلاوت کلام پاک مع ترجمہ - ترانہ جامعہ)

خطاب عام - بعنوان "دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت" "ملک کے موجودہ حالات میں ہماری ذمہ داریاں"

تیسرا اجلاس:- ۱۳ فروری ۸۵ء بعد نماز فجر — درس قرآن —

چوتھا اجلاس:- ۸½ بجے تا ۱۲ بجے۔

تجاویز و مشورے (تحریری طور پر پہلے منگائے جائیں گے)، دستور پر گفتگو۔

پانچواں اجلاس:- ۲½ بجے تا نماز عصر (فارغین جامعہ کی نشست)

چھٹا اجلاس:- بعد نماز عشاء (جمعیۃ الطلبہ کا پروگرام)

قرأت و ترانہ، تقاریر، تمثیلیہ، بیت بازی، مقابلہ برجستہ سوال و جواب۔

ساتواں اجلاس: ۱۴ فروری ۸۵ء بعد نماز فجر — درس حدیث —

آٹھواں اجلاس: ۸½ تا ۱۲ بجے — سیمینار —

اس میں درج ذیل مقامات کے افراد کی شرکت متوقع ہے اور عناوین کے اضافے کا بھی امکان ہے۔

۱- دینی مدارس کا نصب العین اور انکے لئے جامع نصاب تعلیم کی تدوین۔ جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ
۲- دینی مدارس کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی تدابیر ——— دارالعلوم دیوبند
۳- دینی مدارس اور عصری علوم - ہمدرد دہلی ۴- عربی ممالک میں دینی مدارس کی پالیسی۔ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ
۵- دینی مدارس کی ذمہ داریاں اور برادران وطن - مراد آباد ۶- دینی مدارس میں تعلیم قرآن کے مسائل۔ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر
۷- دینی مدارس میں تعلیم حدیث کے مسائل۔ جامعہ سلفیہ بنارس ۸- مدارس اور جدید طریقہ تدریس۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ
۹- طالبات کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ۔ جامعۃ الصالحات رامپور ۱۰- دینی مدارس میں نظام تربیت —— موانع و مشکلات اور حل [illegible]

نواں اجلاس: بعد نماز فجر - اختتامی اجلاس - تجاویز، صدور کی تقاریر، اختتامی کلمات و دعا۔

(قسط ۱)

اسرار احمد خان

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ○

شرک ایک زندہ مسئلہ ہے

اگر یہ کہا جائے کہ شرک آج بھی موجود ہے اور دنیا کے بیشتر حصہ پر اس کی حکمرانی ہے اور انسانوں کی اکثریت اس گندگی میں لت پت ہے۔ تو بہت سے لوگ اس پر تیوریاں چڑھائیں گے۔ وہ اسے دنیائے انسانیت کے خلاف ایک اتہام اور ایک غلیظ گالی تصور کریں گے۔ ان کے خیال میں شرک کا عقیدہ داستانِ پارینہ ہے۔ یہ آج آوٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ یہ اس وقت تھا جب انسان عقل و حکمت کی بلندیوں پر نہیں پہونچا تھا، جب سائنس اور ٹیکنالوجی کا نام بھی ایک گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ آج کا دور سائنسی دور ہے۔ آج ہر بات اپنے آپ کو منوانے کیلئے دلائل کی محتاج ہے۔ جس امر کے پیچھے زورِ استدلال نہیں ہوتا اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ شرک تو ایک غیر عقلی عقیدہ اور نظریہ ہے۔ اس کے پس پشت اس دلیل کے علاوہ اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ "یہ آباو اجداد کی میراث ہے۔"

آج شرک موجود نہیں ہے یا دنیائے انسانیت کے چند گنے چنے افراد اس کے حامل ہیں۔ یہ تصور غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ صورت حال کی صحیح عکاسی نہیں ہے۔ اگر سرسری سا جائزہ بھی دنیائے انسانیت کا لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ مٹھی بھر موحدین کو چھوڑ کر پوری دنیا اس لعنت میں مبتلا ہے۔ جس طرح شرک کی کارفرمائی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کل تھی، اسی طرح آج بھی ہے۔ شرک کے جو اثرات انسانی زندگی پر کل مرتب ہوتے تھے اسی طرح آج بھی ہوتے ہیں۔ جس طرح انسان خالق کائنات کے ساتھ مخلوق کو ساجھی ٹھہراتا تھا اسی طرح آج بھی مخلوق پرستی عام ہے۔ جس طرح صالحین اور بزرگان قوم کی پرستش، کل ہوتی تھی اسی طرح آج بھی قوم کے اکابرین کی پوجا ہوتی ہے۔ کیسے اس بات سے

انکار ہو سکتا ہے کہ دنیا کے اچھے خاصے خطہ پر مارکس اینجلس اور اسٹالن کی تثلیث آویزاں ہے اور یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں گاندھی اور نہرو کی پوجا ہوتی ہے۔ کوئی ان حقائق کی تردید کی جرأت نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کل شرک کی جو شکلیں تھیں اس سے ذرا سا مختلف شکلیں آج ہیں۔ شکل و صورت بدل جانے سے جوہری فرق نہیں پڑ جایا کرتا۔

ایک بات اور ہے جو بڑے زور کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ آج تو شرک کے بجائے الحاد کا دور ہے۔ بے شک آج الحاد انسانوں کی اکثریت کا محبوب ترین عقیدہ و نظریہ ہے لیکن الحاد کیا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ شرک کا ایک جدید ترین پہلو ہے۔ الحاد مادہ پرستی، نفس پرستی اور مخلوق پرستی کے تین ستونوں پر قائم ہے۔ آخر شرک کیا ہے خدا کے ساتھ کسی اور کو پوجنا۔ ایک ملحد خدا سے بیزار سہی لیکن پرستش تو وہ انھیں چیزوں کی کرتا ہے جن کی ایک مشرک کرتا ہے۔ کیا ملحد مارکس اور لینن کے آگے سرِ عقیدت خم نہیں کرتا۔ کیا ایک نیشنلسٹ اپنے قومی ہیروؤں کی پوجا نہیں کرتا۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ الحاد شرک سے الگ کوئی چیز ہے۔

رہا ہمارے ملک ہندوستان کا مسئلہ تو چند افراد کو چھوڑ کر پورا ملک شرک کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مذاہب کی روحانی دنیا میں تو شرک کا ارتکاب ہوتا ہی ہے غیر مذہبی معاملات میں، سیاسی اور سماجی مسائل میں بھی شرک کی حکمرانی ہے۔ یہاں کی تہذیب یہاں کی روایات، یہاں کا ادب، یہاں کا آرٹ، ہر چیز پر شرک کی گہری چھاپ ہے اور تو اور ہندوستان کی اٹھان کیلئے جو ڈھانچہ تشکیل دیا گیا ہے وہ اپنی پوری حیثیت میں شرک پر مبنی ہے۔ اس لئے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ شرک قدیم ترین تصور ہے اور آج اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

شرک مخلوق پرستی کا دوسرا نام ہے

قرآن اور احادیث رسول صلعم کا مطالعہ کرنے سے شرک کا واضح مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے "خدا کی ذات میں اس کے حقوق میں اور اس کے اختیارات میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے۔" خدا کا شریک اب تک خدا کی خلق ہی میں سے کسی کو بنایا گیا ہے۔

عیسائیوں، یہودیوں، مشرکین عرب اور اہل ہنود نے خدا کی ذات میں مخلوق خدا ہی کو شریک کیا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور حضرت مریمؑ کو خدا کی ماں کہا، یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا گردانا، مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانتے تھے اور اہل ہنود بے شمار دیوی دیوتاؤں کو خدا کی ذات کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں خدا کے اختیارات میں بھی مخلوق کو شریک کیا گیا۔ خدا خالق کائنات ہے۔ وہی رازق اور مشکل کشا ہے، وہی دعاؤں کو سننے والا ہے۔ لیکن اہل ہنود نے کہا اس کائنات کی مختلف چیزوں کو مختلف ہستیوں نے بنایا ہے اور ان پر حکمرانی بھی انہیں مختلف قوتوں کی ہوتی ہے۔ پانی کی ضرورت پانی والا دیوتا پورا کرتا ہے لہذا وہی اس لائق ہے اس سے پانی کی دعا مانگی جائے۔ خوراک کا خدا کوئی اور ہے لہذا اس کی دعا اسی سے کرنی چاہئے۔ پارسیوں نے دو خدا ایجاد کئے نیکی کا خدا یزداں اور بدی کا خدا اہرمن۔ آگ کو انھوں نے خدائی قوت کا مظہر تصور کیا۔ اسی طرح خدا کا یہ حق ہے کہ اس کا کہنا کیا جائے، دعا اسی سے مانگی جائے، اسی کے آگے سجدہ کیا جائے اسی سے خوف کھایا جائے، لیکن کہنا خدا کے بجائے مشرک مخلوق خدا کا مانتا ہے، دعا بزرگوں سے، پتھروں سے، مجسموں سے، چاند سے، سورج سے مانگتا ہے اور اسی طرح سجدہ بھی انہیں ہستیوں کو کرتا ہے جن کو وہ بڑا سمجھتا ہے اور خوف بھی اسی سے کھاتا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں شریک خدا مخلوق ہی ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ شرک دراصل مخلوق پرستی کا دوسرا نام ہے تو غلط نہ ہوگا۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، حضرت عزیرؑ، فرشتے، جن، بزرگان دین، مصلحین امت، چاند، سورج اور کائنات کی مختلف قوتیں، پتھر کے بت، دیوتا سب کے سب مخلوق کی قسم میں آتے ہیں۔ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ جہاں جہاں بھی خدا کے اختیارات ہیں، اسکے حقوق ہیں اور اس کی ذات میں مخلوق کو شریک ٹھہرایا گیا ہو وہاں شرک ہے۔ اس کی چاہے جو بھی شکل ہو وہ بہرحال شرک ہے۔ اس لئے اگر عیسیٰؑ اور مریمؑ کو خدائی کے مقام پر لا بٹھانا شرک ہے تو مارکس، لینن اور اسٹالن کو اپنا آقا، حاکم اور مطاع تسلیم کرنا بھی شرک ہے۔ اگر سورج اور چاند کے آگے سجدہ ریز

ہونا شرک ہے تو مادہ پرستی بھی شرک ہے۔ اگر اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی پرستش شرک ہے تو خود پرستی اور نفس پرستی بھی شرک ہے۔

شرک عظیم ترین ظلم ہے

قرآن واضح الفاظ میں شرک کو ظلم عظیم کہتا ہے ان الشرک لظلم عظیم (سورہ لقمان)

آخر شرک کو ظلم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ شرک تو محض ایک عقیدہ ہے بے ضرر عقیدہ اس کا دائرہ صرف انفرادی زندگی کے مخصوص لمحات تک محدود ہے۔ اس کا انسان کی اجتماعی، سیاسی، سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شرک تو محض چند رسومات کے مجموعہ کا نام ہے جس کے تحت مشرک اپنے خود ساختہ معبودوں کے سامنے کبھی سر جھکاتا ہے، کبھی سجدہ کرتا ہے، کبھی منت وسماجت کرتا ہے اور کبھی اس سے اپنی مشکل آسان کرنے کی دعا مانگتا ہے مشرک اگر اپنے ہی جیسے مردہ یا زندہ انسانوں کو اپنا آقا اور مطاع مان کر ان کے آگے جھکتا ہے تو اس سے دوسروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر آخر کس پہلو سے یہ بے ضرر عقیدہ ظلم ہے۔ ظلم تو ایک ایسا عمل ہے جس سے دوسرے متاثر ہوتے ہیں شرک میں تو بظاہر ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ کیا واقعتاً ایسا ہی ہے؟ کیا شرک محض ایک بے ضرر عقیدہ ہے؟ اس کا دائرہ کار انسان کے پرائیویٹ لمحات تک محدود ہے؟ اس کا کوئی تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب پانے کیلئے سب سے پہلے ظلم پر غور کرنا ہوگا۔

ظلم کا نام آتے ہی ہمارا ذہن فوراً نارائن پور کے اس گاؤں تک منتقل ہوتا ہے جہاں پولیس نے بلا وجہ نہتے اور بے ضرر دیہاتیوں کو گولیوں سے اڑا دیا، ان کے مکانات کو جلا دیا، اس آگ میں درختوں، دیہاتیوں اور دیہی گایوں بھینسوں کو بھی جلا دیا۔ پارس بیگھا اور بیلچی کی طرف منتقل ہوتا ہے جہاں کے بیسیوں افراد کو محض اس جرم میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ ہریجن تھے اور وہ کسی اعلیٰ ذات کے دروازے سے گذر گئے، جمشید پور اور مراد آباد کی طرف منتقل ہوتا ہے جہاں بے گناہوں اور معصوم انسانوں کو محض اس لئے گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا گیا کہ وہ موحد تھے مشرک نہیں تھے، ایک خدا کو اپنا رب تسلیم کرتے تھے ان

خداؤں کے آگے انھیں سر جھکانا منظور نہیں تھا۔ مظلوموں اور تباہ حالوں کی طرف جاتا ہے جن کی عزت و آبرو سے کھیلا گیا۔ ظلم کے نام کے ساتھ ہمارے ذہنوں کا ان واقعات و حادثات کی طرف منتقل ہونا ایک فطری امر ہے جس کے سامنے بھی ظلم کا تذکرہ ہوگا اس کی نگاہوں میں مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں، معصوم بچوں اور نہتے انسانوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں جلے اور لٹے ہوئے مکانات اور دوکان کا منظر ابھر آئے گا۔

ظلم نام ہے اس عمل کا جس سے کسی پر زیادتی ہو رہی ہو اور جس سے کسی کا حق غصب ہو رہا ہے۔ یہ ظلم ہی تو ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کو کنوئیں سے پانی اس وجہ سے نکالنے سے روکا جائے کہ وہ ہری جن اور پسماندہ ہیں۔ اور یہ بھی ظلم ہی تو ہے کہ کسی کی ماں، بہن، بیٹی کی آبرو سے کھیلا جائے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ کسی کا مال اڑا لینا، کسی کو اس کے مقام سے بے دخل کر دینا، کسی کو بلا وجہ زد و کوب کرنا، گالی دینا، بے عزتی کرنا، یہ سب ظلم کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان تمام باتوں میں دو چیزیں واضح طور پر پائی جاتی ہے ایک یہ کہ جس پر ظلم کیا جاتا ہے وہ متاثر ہوتا ہے، اس کا کوئی نہ کوئی نقصان ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ مظلوم کی حق تلفی ہوتی ہے ایک حق جو اس کا اپنا ہے بزور چھینا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے شرک کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ محض ایک بے ضرر عقیدہ نہیں ہے بلکہ بدترین قسم کا ظلم ہے۔ شرک کے عقیدہ اور عمل سے بیک وقت تین چیزیں متاثر ہوتی ہیں۔ تین چیزوں کو نقصان پہونچتا ہے اور تین چیزوں کے حقوق تلف کئے جاتے ہیں۔

۱۔ خدا ۲۔ کائنات ۳۔ انسان

مشرک خالقِ کائنات کے حقوق کو تلف کرتا ہے

خالق کائنات اکیلا ہے۔ اس نے اپنی قدرت اور حکمت سے اس پوری کائنات کو وجود عطا کیا ہے۔ اس کا نہ کوئی عزیز ہے اور نہ رشتہ دار۔ اس کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ اسے کسی نے جنم دیا ہے۔ وہ آپ سے آپ ہے۔

ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس قادر مطلق ہستی کی وحدانیت تسلیم کرنا انسانوں پر اس کا حق ہے۔ اگر کوئی اسے تنہا نہ سمجھ کر کسی کو اس کا عزیز اور بیٹا مانتا ہے تو وہ اس کے حق کو مارتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ جو کہ خدا کے بندے ہیں ان کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ کیا یہ خدا کے حق کے ساتھ ظلم نہیں ہے کہ اس کے بندے کو اس کا بیٹا بنا دیا جائے، فرشتوں اور جنوں کو خدا کی اولاد کہا جاتا ہے یہ بھی خدا کی ذات کے حق میں براہ راست مداخلت ہے، ہزاروں پتھر کی بے جان اور بے حس مورتیوں کا تعلق خدا سے جوڑنا خدا پر ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ ہی اس دنیا کا خالق ہے۔ جو کچھ بھی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں سب اسی کی قدرت اور حکمت کا نتیجہ ہے۔ وہی رازق ہے۔ تمام جاندار کو وہ کھلاتا ہے اور پورے نظم کائنات کو وہی ہینڈل کرتا ہے، زندگی اور موت کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے کھیتوں میں غلہ وہی اگاتا ہے، پانی وہی برساتا ہے، ہوائیں وہی چلاتا ہے، پیڑ پودوں کو سرسبزی و شادابی وہی بخشتا ہے، سارا کام تنہا اسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس کے حکم کے مطابق لاکھوں کروڑوں بلکہ بے شمار فرشتے دنیا کے نظم کو چلا رہے ہیں۔ یہ سب اختیارات صرف اور صرف اللہ کے ہیں۔ لیکن ظلم کیا جاتا ہے اللہ کے اس حق کے ساتھ جب تخلیق کائنات میں کسی اور کو شریک کیا جاتا ہے، رزق رسانی کسی اور کا کرشمہ تصور کیا جاتا ہے، بادل پر کسی اور کی حکمرانی سمجھی جاتی ہے، ہواؤں کا مالک کسی اور کو مانا جاتا ہے۔ کیا اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ جو حق صرف اللہ کا ہے وہ اگر ——— کسی ایسی ہستی کو دیا جائے جس کا وہ حق نہیں ہے تو یہ صریح ظلم ہوگا۔

جو ہستی علیم و خبیر، حکیم و بصیر ہے اسی کا یہ حق ہے کہ اس کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔ وہ ہمیں سب کچھ دے سکتا ہے کیونکہ سب کچھ اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ ہماری ضرورتیں وہی پوری کر سکتا ہے کیونکہ وسائل پر حکمرانی اسی کی ہے، ہماری مشکل کو وہی آسان کر سکتا ہے کیونکہ دونوں پر اس کا اختیار ہے۔ اور یہ بھی خالص اسی کا حق ہے کہ اس کے سامنے جھکا جائے۔ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کیا جائے، اسی کے حکم کو قابل عمل سمجھا جائے اسی کے اصولوں کی پیروی کی جائے۔ لیکن انسان اللہ کے اس حق کو پس پشت ڈال دیتا

ہے جب وہ اپنا دامن کسی مزار پر، کسی بزرگ کی قبر پر اور کسی پیر کے آگے پھیلاتا ہے۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ انسان کھائے خدا کا دیا ہوا، پہنے خدا کا دیا ہوا اور شکر ادا کرے دوسروں کا۔ جھکے دوسروں کے سامنے اور سجدہ ریز ہو دوسروں کے در پر۔

مشرک کائنات کا حق مارتا ہے

شرک کے عقیدہ سے انسان دوسری چیز جس پر اثر انداز ہوتا ہے وہ زمین سے آسمان تک پھیلی ہوئی بے پایاں کائنات ہے۔ کائنات کی ہر شے اپنا ایک مقام، اپنا مقصد اور لائحہ عمل رکھتی ہے۔ اس لئے ان اشیاء کا یہ حق ہے کہ انھیں ان کے مقام و مقصد سے نہ ہٹایا جائے۔ سورج انسان کا خادم ہے، اس کا کام ہے کہ وہ دنیا کو ہر روز وقت مقررہ پر روشنی اور گرمی پہونچائے، کسان کی فصلوں کو پکائے اور ایک وقت مقررہ پر دنیا کو رات کے حوالہ کرکے چلا جائے۔ یہ سورج کی حق تلفی ہے کہ اسے خادم کے مقام سے اٹھا کر مخدوم اور آقا کے مقام پر بٹھا دیا جائے، اسے روشنی اور گرمی کا ایک ذریعہ سمجھنے کے بجائے مطلق قوت اور حرارت کا سرچشمہ تصور کر لیا جائے اور اس سے اس طرح عقیدت رکھی جائے گویا وہ قادر مطلق ہے، وہ کسی کو نفع و نقصان پہونچانے پر قادر ہے۔ اس کے آگے اس طرح گریہ زاری کی جائے جیسے وہ سمیع و بصیر ہے۔ جو حق سورج کا ہے اسے چھینا جاتا ہے اور جو حق اس کا نہیں بلکہ سورج کے خالق کا ہے وہ سورج کو دیا جاتا ہے۔ آخر یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ انسانی تصور میں اگر بہن کو بیوی اور ماں کو بہن تصور کرنا ظلم ہے، حق تلفی ہے تو سورج کو مخدوم و آقا سمجھنا اور اس سے اسی تصور کے ساتھ رویہ رکھنا بھی ظلم ہے۔

یہ زمین، یہ سمندر، یہ فضا، سب کچھ انسان کیلئے ہی ہیں۔ انسان کا ان پر حق یہ ہے کہ انھیں صحیح طرح استعمال کرے، اور ان چیزوں کا یہ حق ہے کہ وہ انسانی گرفت میں اپنے آپ کو دیدیں لیکن اس تعلق کی نوعیت بدل دینا، زمین پر فتنہ و فساد برپا کرنا، سمندر کو قزاقی کیلئے استعمال کرنا، فضاؤں کو دوسروں کو نقصان پہونچانے کیلئے تسخیر کرنا ظلم ہے، بدترین ظلم ہے۔

کائنات کی ہر شے کا اپنا ایک خاص ضابطہ اور لائحہ عمل ہے۔ جو ضابطہ ایک شے

کیلئے کل تھا وہی آج بھی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی انسانی آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھی۔ سورج بلاناغہ ہر روز مشرق سے پوری آب و تاب کے ساتھ نکلتا ہے، ہر روز دنیا کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے اور ہر روز ایک رفتار کے ساتھ پچھم میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کے اس عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، پھول گلاب کا کل بھی خوشبو دیتا تھا اور آج بھی دیتا ہے۔ آگ کل بھی جلانے کا کام کرتی تھی اور آج بھی کرتی ہے۔ یہ نظم بتاتا ہے کہ وہ اپنے خالق کے حکم کی پابند ہے۔ ان کے اندر نہ تو جرأت ہے، اور نہ سکت کہ وہ ان احکامات سے گریز کردیں۔ سورج کی مجال نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی روشنی اور حرارت دینا بند کردے اور کسی دن مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوجائے۔ ساری کائنات ایک اٹل قانون میں جکڑی ہوئی ہے وہ اپنے خالق کی مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اسی بنا پر تو یہ اعلان حق کیا گیا ہے۔

الم تر ان اللہ یسجد لہ من فی السموات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب وکثیر من الناس۔ (الحج : ۱۸)

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کچھ کہ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور سورج، چاند، تارے، پہاڑ، درخت، جانور اور بہت سے آدمی۔"

جو اشیاء ایک خدا کی مطیع و فرماں بردار ہیں انھیں مشرک ان راہوں پر استعمال کرتا ہے جو خدا کی بغاوت کی راہیں ہیں۔ ایک مشرک چونکہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر مسئول تصور کرتا ہے اسی لئے وہ ان پر اپنی مرضی اور غرض کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ وہ خدا کو چھوڑ کر یا خدا کے ساتھ ہی ساتھ اپنے نفس اور اپنے ہی جیسے انسانوں کا حکم بجا لاتا ہے اور کائنات کو اسی کی مرضی کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ یورینیم اور ایٹمی طاقتوں کو پرامن مقاصد کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن وہ خدا پرست کہاں ہے، وہ موحد کہاں ہے جو انسانیت کی فلاح کے متعلق سوچے وہ تو مشرک ہے، اپنے نفس اور اپنی اغراض کا بندہ ہے وہ ان طاقتوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے اور کرے گا۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے؟

(باقی اگلے شمارہ میں)

رپورٹ

اجلاس شوریٰ انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ

منعقدہ ۲۹، ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۷ء

۲۹ اکتوبر کو بعد نماز مغرب طے شدہ پروگرام کے مطابق اجلاس کا آغاز ہوا جس میں جناب نسیم محمد غازی فلاحی (صدر انجمن)، جناب شبیر احمد صاحب فلاحی، جناب محمد عمران صاحب فلاحی، جناب انصار احمد صاحب فلاحی، جناب مطیع اللہ صاحب فلاحی، جناب عبدالسلام صاحب فلاحی، جناب مقبول احمد صاحب فلاحی، جناب عبید اللہ صاحب فلاحی، جناب معین الدین صاحب فلاحی اور جناب جاوید اشرف صاحب فلاحی شریک ہوئے۔

جناب نور محمد صاحب فلاحی، جناب اظہار احمد صاحب فلاحی، جناب رضوان احمد صاحب فلاحی اور جناب محمد اسمٰعیل صاحب فلاحی بھی خصوصی مدعوین کی حیثیت سے شریک اجلاس ہوئے۔

جناب ابوالکلام صاحب فلاحی، جناب میر اسحٰق صاحب فلاحی اور جناب حافظ ذاکر لطیف صاحب (ارکان شوریٰ) شریک اجلاس نہ ہو سکے۔ جناب رحمت الاکرم صاحب فلاحی اور جناب مشرف حسین صاحب فلاحی کو بھی خصوصی طور سے مدعو کیا گیا تھا لیکن یہ حضرات بھی شریک نہ ہو سکے۔

کارروائی کا باقاعدہ آغاز جناب مطیع اللہ صاحب فلاحی کی تذکیر سے ہوا جس میں انھوں نے سورۂ والعصر کی روشنی میں دعوت غور و فکر دی۔

اس کے بعد جناب حافظ احسان الحق صاحب فلاحی کے والد مرحوم اور جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب (مدرسی جامعہ) کی والدہ مرحومہ کے انتقال پر ارکان شوریٰ نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ مرحومین کے لئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کیلئے اللہ تعالیٰ سے صبر جمیل کی دعا کی۔

گذشتہ کارروائی کی خواندگی ہوئی اور جائزہ لیا گیا جس میں اس بات کا اضافہ کیا گیا کہ انجمن طلبۂ قدیم کے آئندہ ہونے والے دو سالہ اجلاس کے ناظم جناب انصار احمد صاحب فلاحی کے معاونین میں نور محمد صاحب

کو بھی شامل کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ درج ذیل باتیں طے کی گئیں۔

۱۔ آئندہ دو سالہ اجلاس سے متعلق فنڈ کی فراہمی کے ذمہ دار حسب ذیل حضرات ہوں گے۔

(الف) جناب انصار احمد صاحب فلاحی مرکز (جامعۃ الفلاح) اور قرب و جوار

(ب) 〃 نسیم احمد صاحب فلاحی دہلی

(ج) 〃 عبید اللہ محمد صاحب فلاحی علی گڈھ

(د) 〃 مقبول احمد صاحب فلاحی بریلی

(ہ) 〃 عبدالسلام صاحب فلاحی رامپور

(و) 〃 رضوان احمد صاحب فلاحی (مقیم حال لندن) بیرون ملک

۲۔ دو سالہ اجلاس عام کا تفصیلی پروگرام طے ہوا جسے آپ اسی شمارہ میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس پروگرام میں حسب ضرورت جزوی تبدیلی کا امکان ہے۔

۳۔ مجلہ حیات نو کے ایڈیٹر کے جانے کے بعد ایڈیٹر کی حیثیت سے کسی نئے فرد کا تقرر چار ماہ بعد ہوگا۔ اس دوران سکریٹری انجمن کی نگرانی میں جناب محمد اسمٰعیل صاحب فلاحی، جناب اظہار احمد صاحب فلاحی اور جناب مطیع اللہ صاحب فلاحی مجلہ کی ترتیب، کتابت و طباعت، پیکنگ اور پوسٹنگ وغیرہ کے ذمہ دار ہوں گے۔

۴۔ مجلہ حیات نو کی مالیات کے سلسلہ میں طے ہوا کہ سر دست بیش از بیش خصوصی تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور مکتبۂ حیات نو کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بشرطیکہ کوئی موزوں فرد مل جائے جسے بطور مشاہرہ ایک ہزار روپئے تک دیئے جا سکتے ہیں۔

۵۔ اور سب سے آخر میں صدر انجمن نے شوریٰ کے مشورہ سے یہ اعلان کیا کہ کتب خانہ جامعۃ الفلاح کو تین ہزار روپئے کی کتابوں کا ہدیہ پیش کیا جائے گا۔

اس کے بعد دعا پر اس اجلاس کی کارروائی بحسن و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

جاوید اشرف فلاحی

سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج

۱-۱۱-۱۹۸۷ء

غزلیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

لٹ رہے ہیں ابھی قافلے ہر طرف
غیر محفوظ ہیں راستے ہر طرف
ہر مکاں دیکھئے راکھ کا ڈھیر ہے
آگ بھڑکائی تھی آپ نے ہر طرف
رہنماؤں کی بھی عقل حیران ہے
اتنے دشوار ہیں راستے ہر طرف
شہر میں آگ کا ایک طوفان ہے
فاصلے سے ذرا دیکھئے ہر طرف
ناموافق ہوائیں چلیں گی مگر
جگمگاتے رہیں گے دئے ہر طرف
قافلے قاتلوں کے سنورتے رہے
خون اگلتے رہے راستے ہر طرف
روز روشن میں تصویر غم بن گئے
شب میں ہنستے ہوئے دیکھتے ہر طرف
زندگی آنسوؤں میں ہے ڈوبی ہوئی
جاں گسل ہو گئے مرحلے ہر طرف
سر زمیں راز شعلے اگلتی رہی
کوہ کے بادل برستے رہے ہر طرف

عزیز بگھروی

خنجر بدست ہے نہ یہاں سر بکف کوئی
آثار زندگی کے نہیں اس طرف کوئی
عزت ہر ایک سیپ کی قسمت میں ہے کہاں
ہوتا ہے سرفراز دہان صدف کوئی
دل میں نہیں ہے جس کا کوئی پاس احترام
لے کر اسی کا نام اٹھائے حلف کوئی
ٹھکرا کے موتیوں کو جواہر کو چھوڑ کر
دامن میں بھر کے لے گیا خشت و خزف کوئی
پرواز اپنی اپنی نظر کی جدا جدا
شائستہ سماعت کوئی ننگ سلف کوئی
ہم داستان لوح و قلم کو بھی جو عمل
یارب جہاد حرف و قلم کو شرف کوئی
قائل ہے تیرا طرز تخاطب بھی اے عزیز
روئے سخن کسی کی طرف ہے ہدف کوئی

سوال؟

شیخ منصف مبارکپوری

آج جب ہندوستاں میں ہندیوں کا راج ہے
ہر کوئی اس دیش میں جب اک شہ بے تاج ہے
ہر طرف غارتگری ہے ہر جگہ ہے کشت و خوں
ہند میں گویا کہ اب غارتگروں کا راج ہے
صبح کرنا شام کا جیسے کسی جنگل میں ہو
دل کا اطمینان ہر دم اس طرح تاراج ہے
اہل مغرب کی غلامی میں نہ تھا یوں کشت و خوں
سچ جو پوچھو ملک میں اصلاً غلامی آج ہے
کون کہتا ہے کہ آزادی ملی ہے دیش کو؟
دیش جب ظلم و ستم کا دم بدم آماج ہے
ہے اے منصف ہند میں جمہوریت ہاتھی کا دانت
اکثریت جب مسلمانوں پہ حاکم آج ہے

غزل

شفیع اللہ راز اٹاوی

جو ندامت سے سر جھکاتا ہے
اس پہ رحمت کو پیار آتا ہے
ایک لمحہ جو مسکراتا ہے
مدتوں اشک غم بہاتا ہے
کوئی منصب جو اس کو مل جائے
اپنی اوقات بھول جاتا ہے
شکریہ آپ کی عنایت کا
کون ورنہ مجھے بلاتا ہے
غم زدہ آئینوں کا سوداگر
پتھروں کی ہنسی اڑاتا ہے
دوستی کا لباس پہنے ہوئے
ہر کوئی دشمنی نبھاتا ہے
بڑھ کے منزل پکارتی ہے مجھے
حوصلہ راستہ دکھاتا ہے
موت کو زندگی سمجھتے ہیں
ہم جیالوں کو کیا ڈراتا ہے
باغباں سے نہ پوچھئے یہ راز
کون پھولوں پہ ظلم ڈھاتا ہے

احکام مسکرات

اشیائے نشہ آور کا حکم

یہ نشہ آور اشیاء کے بارے میں ایک سوال کا جواب ہے جس کو مولانا عبدالرؤف صاحب سیالک پوری مفتی جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے سپرد قلم کیا ہے۔ بخیال اختصار کیلئے سوال کو حذف کر دیا گیا ہے۔ سوال کے حذف کر دینے سے بھی نفس مضمون کی افادیت بدستور باقی ہے۔ (مدیر)

شراب عربی زبان کا لفظ ہے۔ شرب لغۃً ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو لوگ پیتے ہیں اور فقہائے کرام کی اصطلاح میں اس پینے کی چیز کو کہتے ہیں جو نشہ پیدا کرتی ہے۔

خمر اس شراب کو کہتے ہیں جو انگور کے رس سے تیار ہوتی ہے۔ انگور کے رس میں جب جوش پیدا ہو کر تیزی پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں نشہ لانے کی خاصیت آ جاتی ہے ___________ امام اعظم صاحب کے نزدیک ضروری ہے کہ اس میں جھاگ بھی پیدا ہو جائے۔ اسی کو اصلاً خمر کہتے ہیں اور کبھی مجازاً ہر قسم کی شراب کو بھی خمر کہتے ہیں خواہ وہ گندم، جَو، یا انجیر یا کھجور (رطب و تمر) یا شہد وغیرہ سے تیار کی گئی ہو۔ خمر حرام بعینہٖ ہے۔ اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اس کی حرمت پر اجماع امت ہے۔ یہ نجس بنجاست غلیظہ ہے۔ خمر کا کثیر و قلیل ہر مقدار حرام ہے۔ اس کا پینا ہو یا خارجی استعمال ہر ایک ناجائز ہے۔ جو خمر کو حلال کہے وہ کافر ہے کیونکہ اس کی حرمت کا منکر نص قرآنی کا منکر ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (سورۃ المائدہ)

اس آیت میں خمر کو رجس من عمل الشیطٰن کہا گیا ہے اور اس سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔

اس سے اس کی قباحت و شناعت ظاہر ہے۔ یہ خمر مسلمانوں کے حق میں متقوم بھی نہیں ہے پس اگر کسی نے کسی مسلمان کی شراب تلف کر دی تو اس پر ضمان نہیں ہے اس کو خریدنا بھی صحیح نہیں ہے اور اس کی کسی قسم سے انتفاع جائز نہیں ہے۔ نہ اس کو کوئی دوا کے طور پر استعمال کر سکتا ہے نہ اس کو کسی جانور کو پلا سکتا ہے۔ جانور کے زخم پر بھی اس کو بطور علاج کے بھی لگانا درست نہیں ہے۔ اگر اس سے کوئی مٹی بھگانا چاہے تو یہ بھی درست نہیں ہے حقنہ کے کام میں بھی اس کو نہیں لا سکتے۔ اس کے پینے والے پر حد جاری کی جائے گی اگرچہ پینے سے نشہ نہ آئے۔ کسی کافر کو بھی پلانا جائز نہیں ہے اگرچہ علاج کے لئے پلائے۔ اس کا پلانے والا گنہگار ہو گا۔ جو مسلمان اپنی دعوتوں میں ایسے غیر مسلموں کو مدعو کرتے ہیں جو شراب پیتے پلاتے ہیں ان کو بھی شراب پلانا گناہ ہے۔ اس کا وبال پلانے والے پر ہو گا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لعن اللہ الخمر وشاربھا وساقیھا وبائعھا ومبتاعھا وعاصرھا ومعتصرھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ۔ "یعنی اللہ تعالے نے خمر پر لعنت فرمائی ہے اور اس کے پینے والے اور پلانے والے اور بیچنے والے اور خریدنے والے اور کشید کرنے والے اور کشید کرانے والے اور ڈھو کر لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس اٹھا کر لے جائی گئی ہو۔"

اور ایک حدیث میں اس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا گیا ہے جس پر شراب پی جا رہی ہو۔ خمر اگرچہ شراب انگوری کو کہتے ہیں لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو ان تمام چیزوں کے لئے عام قرار دیا جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں۔

اس امت پر خمر کی تحریم بتدریج فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت مذکورہ بالا کے نزول سے پہلے اس کے بارے میں دو ہدایتیں اور بھی نازل ہو چکی تھیں جو سورۃ البقرہ آیت ۲۱۹ اور سورہ النساء آیت ۴۳ میں موجود ہیں۔ اس آخری حکم کے نازل ہونے کے پہلے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں لوگوں کو متنبہ فرما دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے بعید نہیں کہ اس کی قطعی حرمت کا حکم آ جائے۔ لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہے اس کو فروخت کر دیں۔ اس کے بعد کچھ مدت پر جب یہ مذکورہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ نے اعلان کرایا کہ اب جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہے وہ اس کو ضائع کر دیں۔ اب وہ اس کو نہ پی سکتے ہیں نہ بیچ سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں شرابیں بہا دی گئیں۔ بعض لوگوں نے

پوچھا ہم اسے بطور تحفے کے یہودیوں کو کیوں نہ دے دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ حرام کرنے والے نے اسے تحفے کے طور پر بھی دینے سے منع فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے پوچھا کہ ہم شراب کا سرکہ کیوں نہ بنالیں۔ آپؐ نے اس سے بھی منع فرمایا اور اس کو بہا دینے کا حکم فرمایا۔ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ دوا کے طور پر تو استعمال کی اجازت ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے۔

ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ ہم ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جہاں سردی بہت پڑتی ہے اور ہم کو محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں ہم شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی ہے؟ ان لوگوں نے کہا ہاں! وہ نشہ آور ہے۔ فرمایا تو اس سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں مانیں گے۔ تو فرمایا کہ اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔

تحریم خمر کی آیت اس سلسلے کی تیسری آیت ہے۔ اس سلسلے کی پہلی آیت سورۃ البقرہ میں ۲۱۹ نمبر کی آیت ہے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ "لوگ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو، ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اور لوگوں کے لئے منفعتیں بھی ہیں مگر ان کی خرابی یعنی گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔"

اس سلسلے کی دوسری آیت سورۃ النساء کی تینتالیسویں آیت ہے یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ الخ" اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم جب نشے کی حالت میں رہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ تم کو اس وقت نماز پڑھنی چاہئے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ الخ

اس آیت سے محض نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ نشہ کس چیز سے پیدا ہو اس کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نشہ خواہ کسی چیز سے پیدا ہوا ہو مذموم اور شراب کے نشے کے حکم میں ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی ہمیں واضح ارشادات علی سبیل الاطلاق ملتے ہیں۔ کل مسکر خمر وکل مسکر حرام ہر نشہ آور شے خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ کل شراب اسکر فھو حرام ہر وہ مشروب جو نشہ لائے حرام ہے۔ انا انھی عن کل مسکر میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔

اس سلسلے میں حدیث کے اندر ایک اصول بھی بیان کیا گیا ہے ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ لائے تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔ ما اسکر الفرق منہ فملا الکف منہ الحرام۔ جس چیز کی فرق بھر مقدار نشہ پیدا کرے تو اس کا ایک چلو بھی حرام ہے۔

معلوم ہوگیا کہ ہر نشہ آور شے (مسکر) حرام ہے۔ نہ اس کا داخلی استعمال درست ہے نہ خارجی۔ لیکن اضطرار کی صورت میں یا جبکہ طبیب حاذق بتائے کہ شراب کے سوا اس کا کوئی اور علاج نہیں ہے تو شیخین علیہما الرحمہ کے قول کے مطابق بقدر ضرورت استعمال کرنے کی گنجائش ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ کی اس آیت ۱۷۳ میں محرمات کے استعمال کی اضطراراً تین شرطوں کے ساتھ اجازت دی گئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے: انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ ان اللہ غفور رحیم۔ "خدا نے تم پر حرام کر دیا ہے تمہارے اوپر مردار اور خون اور سور کے گوشت کو اور اس چیز کو جس پر غیر اللہ کے لئے آواز بلند کی گئی ہو۔ پس جو شخص مضطر ہو کر بغیر رغبت کے ضرورت سے زیادہ نہ استعمال کرے تو اس کے اوپر گناہ نہیں ہے بلاشبہ اللہ مغفرت کرنے والا مہربان ہے۔"

یعنی محرمات کے استعمال میں اس وقت کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ اول اضطرار (مجبوری) کی حالت ہو مثلاً بھوک، پیاس یا بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اور اس حالت میں حرام کے سوا اور کچھ میسر نہ ہو۔ دوم یہ کہ ان کا استعمال نفرت کے ساتھ کرے۔ سوم یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کرے یعنی جتنی مقدار سے کام چل سکے اس سے ذرا بھی زیادہ نہ استعمال کرے لیکن تقویٰ اس میں ہے کہ اس کے دوا کے استعمال سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔

چنانچہ امداد الفتاویٰ میں اسپرٹ کے بارے میں جو روح شراب ہوتی ہے، لکھا ہے:

اسپرٹ اگر عنب (انگور) اور زبیب (منقی) اور رطب (تر کھجور) اور تمر (چھوہارا خشک کھجور) سے حاصل نہ کی گئی ہو تو اس میں گنجائش ہے بلا اختلاف ورنہ گنجائش نہیں ہے بالاتفاق۔

چونکہ اسپرٹ ایک تیز قسم کی شراب ہوتی ہے جو شراب کو تقطیر کر کے بنائی جاتی ہے۔ چونکہ ہندوستان میں جو شرابیں بنائی جاتی ہیں وہ علی العموم گھٹیا کوالٹی کی ہوتی ہیں جو آلو، مہوا، بیر، جو، گیہوں وغیرہ جیسی سستی چیزوں سے بنائی جاتی ہیں تاکہ سستی پڑیں۔ اور یورپ کی بنی ہوئی شرابیں بڑھیا کوالٹی کی ہوتی ہیں

انگور، منقی، انار، سیب، خرما، کھجور وغیرہ سے تیار کی جاتی ہیں۔ پس اگر ان سب سے لائی ہوئی شراب دوا میں ملائی گئی ہو تو یہ احتمال کسی قدر قوت کے درجے میں ہو سکتا ہے کہ انگور یا منقی جیسی اشیاء سے بنی ہوئی شراب ہوگی۔ جس سے وہ دوا بھی حرام و نجس ہے۔ اگرچہ اس احتمال سے ہر دوا میں عدم جواز کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ بلا ضرورت ایسی دواؤں کا استعمال نہ کیا جائے کیونکہ شک کا شریعت میں اعتبار نہیں ہے۔ البتہ ایسے موقع پر اجتناب بہتر ہے۔

فتاوی شامی باب الرضاع ج ۲ ص ۴۲۳ میں ہے اختلف فی التداوی بالمحرم وظاهر المذهب المنع كما في ارضاع البحر وقيل يرخص اذا علم فيه الشفاء ولم يعلم دواء آخر كما رخص الخمر للعطشان وعليه الفتوى۔

حرام چیز سے دوا علاج کرنے میں اختلاف ہے ظاہر مذہب ممنوعیت ہے جیسا کہ بحر الرائق باب الرضاع میں ہے۔ ضعیف قول یہ بھی ہے کہ رخصت دی جاتی ہے جب اس میں شفا معلوم ہو اور کوئی دوسری دوا نہ معلوم ہو جیسا کہ رخصت دی گئی ہے پیاسے کے لئے (حالت اضطرار میں) اور اسی پر فتویٰ ہے۔

اس سے دیگر نشہ آور اشیاء کا حکم بھی واضح ہو گیا۔ افیون قطعی حرام ہے جس سے احساس شدید طور پر متاثر ہوتا ہے جس کی کثیر مقدار کھانے کھلانے میں موت ہو سکتی ہے۔ گویا یہ ایک قسم کا زہر ہے۔ اسی طرح اور بہت سی اشیاء ہیں جن میں کوئی ایسی تاثیر ہوتی ہے جو صحت کے لئے مضرت رساں ہوتی ہے۔ کبھی ان سے جان کا خطرہ بھی لاحق ہو جاتا ہے اس لئے ان کا استعمال مذموم ہوتا ہے۔ لیکن ان کا جرم و نجس نہیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ سنکھیا یا دھتورہ کو لیجئے ان میں نشہ نہیں ہے لیکن ان کی کثیر مقدار اپنی سخت مضرت کی وجہ سے موت کا باعث ہو سکتی ہے بلکہ ہوتی ہے اس لئے سنکھیا پاک و نجس ہے نہ دھتورہ، لیکن سخت خطرناک ہے۔ کبھی شدید نشہ سے بھی موت واقع ہو سکتی ہے جیسے اسپرٹ ہے شراب ہی کے مختلف اجزاء کا، اس میں سخت نشہ آور تاثیر ہوتی ہے جس کی کثیر مقدار پینے سے آدمی موت کا شکار ہو سکتا ہے۔

ہاں البتہ کسی چیز کی قلب ماہیت ہو جائے تو اس کا حکم و اثر بھی بدل جاتا ہے۔ تاڑی شراب کے سرکہ میں بھی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ قلب ماہیت سے پہلی اصل شے باقی نہیں رہتی اس لئے اس کا حکم بھی دوسرا ہو جاتا ہے لہذا تاڑی یا شراب جب سرکہ بن جائیں تو اب نہ وہ تاڑی ہے نہ شراب بلکہ

اب ایک دیگر نئی چیز ہو گئی اس لئے اس کا حکم بھی دوسرا ہو گیا یعنی اب اس کا استعمال داخلی ہو یا خارجی جائز ہے۔

البتہ تاڑی یا شراب سے سرکہ بنانا خود مذموم امر ہے جیسا کہ مذکورہ بالا ایک حدیث میں اس کی صریح ممانعت موجود ہے۔

اوپر لکھ چکا ہوں کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ آور ہوتی ہے اس کی تھوڑی مقدار بھی جائز نہیں ہے۔ اسی سے اس کے برعکس یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جس کی قلیل مقدار کا استعمال جائز ہو اس کی کثیر مقدار نشہ آور نہیں ہوگی۔ اگر اس کی کثیر مقدار مضرت رساں ہو تو اپنے کسی اور ضرر کی وجہ سے ممنوع ہوگی۔ افیون کو بھی اسی پر قیاس کیجئے۔ بچوں کو کھلانے پلانے میں کبھی زیادہ ہو جانے پر جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔ ●●

غزل

ابوالبیانات حماد

عدل و انصاف کی مسند پہ جفا ٹھہری ہے
ورنہ ٹھہری ہے جو مجرم تو وفا ٹھہری ہے

کبھی زنداں بلا اور کبھی دار و رسن
کیا یہی جرم محبت کی سزا ٹھہری ہے

قافلہ تھک کے رکا ہے ذرا ستانے کو
عرصہ کچھ دیر کو یوں باد صبا ٹھہری ہے

پست اس سے نہ ہو حوصلۂ اہل جنوں
چھیڑتے رہنا ہی ظالم کی ادا ٹھہری ہے

اب مجھے سود و زیاں کا بھی نہیں اندیشہ
آشیاں پہ جو مرے برق بلا ٹھہری ہے

درد خود بڑھ کے نہ کیوں اپنی دوا بن جائے
دردِ دل کی جو مجرب ہے دوا ٹھہری ہے

جانے اظہار تمنا کی سزا کیا ہوگی
نام لینا بھی کسی کا جو خطا ٹھہری ہے

بازگشت اس کی فضاؤں میں سنائی دے گی
کون کہتا ہے کہ اب حق کی صدا ٹھہری ہے

جلوۂ حسن ازل کے ہیں نرالے انداز
سرخی خون شہادت جو حنا ٹھہری ہے

حق کی آواز رکی بھی ہے کہیں روکے سے
کوئی ٹھہرائے تو کیا باد صبا ٹھہری ہے

اس میں کچھ خوبیٔ جوہر بھی ہے جو شامل حماد
عرش کے پاس ہی جا کر وہ دعا ٹھہری ہے

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ

[illegible]

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت باشا

اس جلیل القدر صحابی کا اسم گرامی خالد بن زید ابن کلیب تھا، ان کی کنیت ابو ایوب تھی اور ان کا تعلق انصار کے قبیلہ بنو نجار سے تھا۔ ہم مسلمانوں میں سے کون ہے جو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ناواقف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سارے مسلمانوں کے مکانات کو چھوڑ کر ان کے مکان کو اس وقت اپنے رسول ﷺ کے قیام کے لئے منتخب فرمایا، جب وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، ان کے ذکر کو سارے عالم میں مشہور اور ان کے مقام کو ساری مخلوق میں بلند کر دیا اور تنہا یہی ایک بات ان کے فخر کے لئے کافی ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر میں نزول اجلال فرمانے کی داستان بڑی دلکش اور شیریں داستان ہے جس کا ذکر کانوں کو ہر بار ایک نئی اور عجیب لذت سے آشنا کرتا ہے۔

جب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو وہاں کے باشندوں نے ادب و احترام اور عقیدت و محبت سے بھرے ہوئے دل و نگاہ کو فرش راہ کر دیا۔ انھوں نے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیئے کہ آپ ان کی گہرائیوں میں اتر جائیں۔ انھوں نے اپنے گھروں کے پٹ وا کر دیئے کہ آپ ان کے اندر پوری عزت و توقیر کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے چند روز مدینے کی مضافاتی بستی قبا میں گزارے۔ اس دوران آپ نے وہاں ایک مسجد کی تعمیر کی، وہ پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔ پھر آپ وہاں سے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے اور یثرب کے تمام بڑے بڑے سردار اس کے رستے میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ حسین آرزو کروٹیں لے رہی تھی کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں قیام کرنے پر آمادہ کرنے کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تمام سرداران یثرب باری باری اونٹنی کے آگے کھڑے ہو جاتے اور اس کا راستہ روک کر عرض کرتے:

"اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔ ہم اپنی قوت، ساز و سامان اور کثیر افراد کے ذریعے آپ کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔" لیکن آپ ہر ایک کو یہی جواب دیتے کہ "اسے چھوڑ دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے۔"

اونٹنی اپنی منزل کی طرف بڑھتی رہی اور مشتاق نگاہیں آرزو مند قلوب کے جلو میں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ جب وہ کسی مکان کے سامنے سے گزر کر اس سے آگے نکل جاتی تو اس کے مکینوں پر حزن و ملال طاری ہو جاتا، ان کے اوپر مایوسی و ناامیدی مسلط ہو جاتی اور ان کے بعد والوں کے دلوں میں امید کی شمع جگمگا اٹھتی تھی۔ اونٹنی اسی طرح یکے بعد دیگرے مختلف گھروں کے سامنے سے گزرتی رہی اور لوگ اپنی محرومی پر غم و اندوہ کی تصویر بنے اس خوش بخت کو جاننے کے شوق میں، جس کے حصے میں یہ نعمت سرمدی آنے والی تھی، اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ حتیٰ کہ اونٹنی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مکان کے سامنے خالی پڑے ہوئے ایک میدان میں پہنچ کر بیٹھ گئی لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کی پشت سے اتر کر نیچے تشریف نہیں لائے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور آگے چل پڑی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی نکیل کو ڈھیلی چھوڑ دیا۔ چند قدم چل کر اونٹنی مڑی اور واپس آ کر دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں پہلی بار بیٹھی تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا دل فرحت و انبساط سے لبریز ہو گیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنے کے لئے تیز قدموں کے ساتھ لپکے۔ انھوں نے آپ کا سامان اٹھایا اور اسے خوشی خوشی اپنے گھر میں اس طرح لائے جیسے دنیا کا سارا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہو۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کا مکان دو منزلہ تھا۔ انھوں نے بالائی منزل کو اپنے اہل خانہ کے سامان سے خالی کر دیا تاکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس میں قیام فرمائیں۔ لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نچلی منزل کو بالائی منزل پر ترجیح دی اور اسے اپنے قیام کے لئے پسند فرمایا۔ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے آپ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور آپ کو اسی جگہ ٹھہرا دیا جسے آپ نے پسند فرمایا تھا۔

جب رات ہوئی اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آرام فرمانے کے لئے اپنی خواب گاہ میں تشریف لے جا چکے تو حضرت ابو ایوب اور ان کی اہلیہ بالائی منزل میں چلے گئے لیکن جیسے ہی انھوں نے دروازہ بند کیا معاً ان کے دل میں ایک خیال آیا اور اپنی اہلیہ سے مخاطب ہوئے:

"تمہارا بھلا ہو یہ ہم نے کیا کیا؟ کیا یہ بات مناسب ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نیچے ہوں اور ہم ان سے اوپر رہیں؟ کیا یہ بات ہم کو زیب دیتی ہے کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر چلیں پھریں؟ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور وحی الٰہی کے درمیان حائل ہونا ہمارے لئے زیبا ہے؟ آہ! اس صورت میں تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

اس وقت وہ دونوں میاں بیوی سخت حیرانی و پریشانی سے دوچار تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ دونوں ساری رات بھر بے چین رہے۔ آخر کار ان کو اس وقت تھوڑا سا سکون میسر آیا جب وہ بالا خانے کے اس گوشے میں سمٹ گئے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اوپر نہیں واقع تھا وہ دونوں وہیں گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر چلتے تو بیچ سے چلنے کے بجائے کنارے کنارے چلتے تھے۔ صبح کو حضرت ابو ایوبؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ "آج کی رات میں نے اور ام ایوب نے آنکھوں میں کاٹی ہے۔" آپ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! رات بھر ہم کو یہ احساس بے چین کئے رہا کہ ہم جس مکان کی بالائی منزل میں ہیں، آپ اس کے نیچے تشریف فرما ہیں اور جب ہم چلتے اور حرکت کرتے ہیں تو دھول اور گرد و غبار آپ کے اوپر گرتا ہے آپ کے لئے اذیت کا سبب بنتا ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ ہم آپ کے اور وحیٔ الٰہی کے درمیان حائل ہو رہے ہیں۔"

"ابو ایوب! اس کی فکر اور پرواہ مت کرو۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "چونکہ بکثرت لوگ میرے پاس ملنے کے لئے آتے رہتے ہیں اس لئے نیچے ہی رہنا میرے لئے زیادہ مناسب اور آرام دہ ہے۔"

حضرت ابو ایوبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا اور بالائی منزل میں قیام پذیر رہا۔ یہاں تک کہ ایک سرد رات کو ہمارا پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا اور اس کا پانی اوپری منزل کے فرش پر پھیل گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی اس پھیلے ہوئے پانی کو جذب کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت ہمارے پاس صرف ایک ہی کمبل تھا جس کو ہم لحاف کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ پانی نیچے ٹپک کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے باعث پریشانی نہ بن جائے، ہم نے اسی کمبل سے پانی کو جذب کر لیا۔ پھر صبح کے وقت میں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ سے اوپر رہوں اور آپ مجھ سے نیچے رہیں۔ پھر میں نے رات کو پیش آنے والا گھڑے کا واقعہ آپ کے گوش گزار کیا اور آپ سے بالائی منزل میں منتقل ہو جانے کی درخواست کی۔ آپ نے میری یہ درخواست منظور فرمالی اور اوپر کی منزل میں منتقل ہو گئے اور میں ام ایوب کے ساتھ نیچے آ گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوبؓ کے مکان میں تقریباً سات مہینے تک قیام پذیر رہے۔ یہاں تک جب اس زمین پر مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی جس میں اونٹنی بیٹھی تھی تو آپ ان حجروں میں منتقل ہو گئے جو مسجد کے ارد گرد آپ کے اور آپ کی ازواج مطہرات کے لئے بنائے گئے تھے اور آپ حضرت ابو ایوبؓ کے پڑوس میں رہنے لگے۔ کتنے اچھے اور شریف پڑوسی تھے جو ان دونوں کو میسر آئے تھے۔

حضرت ابو ایوبؓ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے ایسی محبت تھی جس نے باہمی تعلقات کے سارے پردے درمیان سے اٹھا دیئے تھے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ گرمی کی ایک سخت دوپہر میں گھر سے نکل کر مسجد کی طرف آئے۔ جب حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ کر پوچھا کہ "ابو بکر! آپ اس وقت گھر سے کیوں نکلے ہیں؟"

"بھوک کی شدت اور بے چینی کی وجہ سے۔" حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا۔

"بخدا قسم۔ میرے گھر سے نکلنے کا سبب بھی یہی ہے۔" حضرت عمرؓ نے کہا۔

اتنے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی اپنے حجرے سے تشریف لائے اور ان دونوں حضرات سے دریافت کیا۔ "آپ دونوں اس وقت کس غرض سے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے ہیں؟"

"واللہ ہم سب اس بھوک سے بے چین ہو کر نکلے ہیں جس کو ہم اپنے اندر شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔" دونوں نے جواباً عرض کیا۔

"اس ہستی کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں نے بھی اسی سے پریشان ہو کر گھر سے قدم نکالا ہے۔" آپ نے فرمایا "اٹھئے، میرے ساتھ چلئے۔" اور تینوں حضرات حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ حضرت ابو ایوبؓ کا معمول تھا کہ وہ روزانہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز بچا کر رکھتے تھے۔ اور جب آپ کسی وجہ سے تاخیر کرتے اور وقت مقررہ پر تشریف نہ لاتے تو وہ کھانا گھر والوں کو کھلا دیتے۔ جب یہ لوگ دروازے پر پہنچے تو حضرت ام ایوبؓ گھر سے نکل کر ان کے پاس آئیں اور بولیں۔

"نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی تشریف آوری ہماری عزت افزائی کا باعث ہے۔"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ "ابو ایوبؓ کہاں ہیں؟"

حضرت ابو ایوبؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی آواز سن لی۔ وہ قریب ہی اپنے کھجوروں کے باغ میں کام کر رہے تھے۔ وہ یہ کہتے ہوئے تیز تیز آگے پہنچے "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کا آنا ہمارے لئے باعثِ افتخار ہے۔" پھر انھوں نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! یہ آپ کی تشریف آوری کا یہ وقت کیسے ہوئی؟ آپ تو اس وقت کبھی تشریف نہیں لاتے تھے۔" حضورؐ نے فرمایا "ابو ایوب تم ٹھیک کہتے ہو۔"

پھر حضرت ابو ایوبؓ باغ میں گئے اور اس میں سے کھجوروں کا ایک گچھا کاٹ لائے جس میں تمر، رُطب اور بُسر ہر قسم کی کھجوریں لگی ہوئی تھیں۔ پیارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا:

"اسے کاٹنے کی کیا ضرورت تھی، کیوں نہیں تم نے اس میں سے صرف پکی ہوئی کھجوریں ہی توڑ لیں؟"

انھوں نے کہا "میں نے مناسب سمجھا کہ آپ اس میں سے تمر، رُطب، اور بُسر ہر قسم کی کھجور اپنی پسند کے مطابق تناول فرمائیں۔ اس کے علاوہ میں آپ کے لئے ایک بکری بھی ذبح کروں گا۔" تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر ذبح کرنا تو دودھری بکری مت ذبح کرنا۔"

پھر حضرت ابو ایوبؓ نے بکری کا ایک سال کا بچہ لیا اور اسے ذبح کر دیا۔ پھر انھوں نے اپنی اہلیہ سے کہا:

"ایوب کی ماں! آٹا گوندھ کر ہمارے لئے روٹیاں پکاؤ۔ تم بہت عمدہ روٹیاں پکانا جانتی ہو۔"

اس کے بعد انھوں نے آدھا گوشت پکایا اور آدھے کو بھون لیا۔ جب کھانا پک کر تیار ہو گیا اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھیوں کے سامنے رکھ دیا گیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے گوشت میں سے ایک ٹکڑا لیا اور اس کو روٹی میں رکھ کر فرمایا "ابو ایوب! یہ ٹکڑا جلدی سے فاطمہ کو دے آؤ۔ اس کو کئی دنوں سے ایسا کھانا نہیں ملا ہے۔"

پھر جب سب لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "روٹی، گوشت، تمر، رُطب اور بُسر!" یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ پھر ارشاد فرمایا:

"قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہی وہ نعمت ہے جس کے متعلق قیامت کے روز تم سے سوال کیا جائے گا۔ تو جب تم کو اس قسم کی نعمت ملے اور تم اسے کھانے کے لئے اپنے ہاتھ میں لو تو کہو بسم اللہ اور جب آسودہ ہو جاؤ تو کہو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هُوَ اَشْبَعَنَا وَاَنْعَمَ عَلَیْنَا فَاَفْضَلَ۔ — اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو آسودہ کیا (شکم سیر کیا) ہم کو انعام سے نوازا اور ہمارے اوپر مہربانی کی۔

پھر آپؐ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے حضرت ابو ایوبؓ سے فرمایا "کل ہمارے پاس آنا!" (آپؐ کا معمول تھا کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ احسان کرتا تو آپؐ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اس کے احسان کا بدلہ چکا دیں)۔ حضرت ابو ایوبؓ حضورؐ کی یہ بات نہیں سن سکے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ:

"ابو ایوب! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کل تم میرے پاس آنا۔" تو حضرت ابو ایوبؓ نے کہا کہ:

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم میرے سر اور آنکھوں پر۔"

جب دوسرے دن حضرت ابو ایوبؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو ایک لونڈی (جو آپؐ کی خدمت کیا کرتی تھی) یہ کہتے ہوئے عنایت فرمائی "ابو ایوب! اس کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا۔ یہ جب تک ہمارے پاس رہی ہے ہم نے اس میں سوائے خیر کے کچھ نہیں دیکھا۔"

وہ لونڈی کو لئے ہوئے گھر لوٹے۔ جب ام ایوبؓ نے دیکھا تو بولیں:

"ابو ایوب! یہ لونڈی کس کی ہے؟"

"ہماری ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عنایت فرمائی ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

یہ سن کر ام ایوبؓ نے کہا "کتنا عظیم ہے عطا کرنے والا اور کتنا عمدہ ہے یہ عطیہ۔"

"اور آپؐ نے ہم کو اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے۔" حضرت ابو ایوبؓ نے دوبارہ کہا۔

"ہم اس کے ساتھ کون سا رویہ اختیار کریں کہ آپؐ کی ہدایت پر پورا پورا عمل کر سکیں۔" انھوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرنے کی اس سے بہتر دوسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ اس کو آزاد کر دیں۔" انھوں نے حل پیش کر دیا۔

"آپ کو صحیح راہ سوجھی۔ آپ کو درست بات کی توفیق ملی۔" حضرت ام ایوبؓ نے ان کی تائید کی۔ اور حضرت ابو ایوبؓ نے لونڈی کو آزاد کر دیا۔

یہ حضرت ابو ایوبؓ کی عام اور روز مرہ کی زندگی کی چند جھلکیاں تھیں۔ اگر آپ کو ان کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ زندگی کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کو مل جائیں تو یقیناً آپ حیرت و استعجاب سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک غازی اور مجاہد کی طرح گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عہد نبوی سے لے کر دور معاویہؓ تک کسی غزوے سے پیچھے نہیں رہے جو مسلمانوں کو پیش آیا، سوائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے محاذ پر برسرِ پیکار ہوں۔

وہ غزوہ حضرت ابو ایوبؓ کا آخری غزوہ تھا۔ جب حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنے بیٹے یزید کی قیادت میں قسطنطنیہ کی فتح کے لئے فوج بھیجی تھی۔ حضرت ابو ایوب اس وقت کافی عمر رسیدہ تھے۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال کے قریب تھی لیکن یہ کبر سنی ان کو یزید کی فوج میں شامل ہونے اور معرکہ کارزار میں ایک مجاہد کی حیثیت میں داخل ہونے سے نہ روک سکی۔ وہ فوج میں ایک عام سپاہی کی طرح شریک ہوئے لیکن دشمن کے ساتھ جنگ چھڑے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے اوپر بیماری کا ایسا شدید حملہ ہوا جس نے ان کو شرکت جنگ سے معذور کر دیا۔ ان کی شدید علالت کی خبر پا کر قائد سپاہ اسلامی یزید بن معاویہؓ ان کی عیادت کے لئے آیا اور ان سے دریافت کیا۔

"ابو ایوبؓ! آپ کی کوئی خواہش ہے؟"

"غازیان اسلام کو میرا سلام کہنا" حضرت ابو ایوبؓ نے فرمایا۔ "اور ان سے کہنا کہ ابو ایوب کی وصیت ہے کہ دشمن کی سرحد میں اندر تک گھس جاؤ اور مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤ اور میری لاش کو قسطنطنیہ کی فصیلوں کے نیچے دفن کر دو۔" یہ کہتے کہتے میزبان رسول نے آخری ہچکی لی اور طائر روح قفس عنصری سے آزاد ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مجاہدین نے صحابی رسول کی آخری خواہش اور وصیت کا پورا پورا احترام کیا۔ انھوں نے دشمن پر پے در پے اور شدید حملے کئے اور اسے دھکیلتے اور آگے بڑھتے ہوئے فصیل شہر تک پہنچ گئے۔ وہ حضرت ابو ایوبؓ کی لاش مبارک کو ساتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں ان کی وصیت کے مطابق قبر تیار کی گئی اور اس میں ان کو دفن کر دیا گیا ۔۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

انھوں نے اس کے سوا اور کسی صورت کو پسند نہیں کیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے میدان جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ پر ان کو موت آئے۔ حالانکہ ان کی عمر اس وقت اسی سال کے قریب تھی۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابو ایوبؓ پر رحم فرمائے اور ان سے راضی ہو۔ آمین۔

ترتیب :- صباح الدین فلاحی

تسخیر عالم کے لئے کمیونسٹ ہتھکنڈے

خروشچیف کے زمانہ اقتدار میں بھی سوویت روس کا علانیہ مقصد یہی تھا کہ "سرمایہ داری کے نظام کو دفن کر کے دنیا پر کمیونسٹ نظام حکومت مسلط کیا جائے"۔ سوال یہ ہے کہ تسخیر عالم کے لئے کمیونسٹوں کا طریقہ کار کیا ہے؟ اور اس کے لئے وہ کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں؟ اس مضمون میں انہی طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھیں کمیونسٹ حضرات علاقوں اور ممالک کی تسخیر کے لئے استعمال کرتے آئے ہیں۔ غیر کمیونسٹ ملکوں پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے کمیونسٹوں نے اب تک یہ چار طریقے آزمائے ہیں اور آج بھی ان پر عمل پیرا ہیں۔

تاریخی طور پر دو سماجی اور فوجی انقلابوں نے کمیونسٹوں کو حکمرانی بخشی ہے۔ روس میں بالشویک پارٹی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کی قیادت کی تھی اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر آخری فتح سے ہمکنار ہوئی تھی۔ کمیونسٹ چین میں بھی اسی طرح کا انقلاب آیا تھا۔

دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ کسی ملک کو نشانہ بنا کر کمیونسٹ فوجیں ان کی سرحدوں پر جمع ہو جاتی ہیں اور مستقل خطرہ بنی رہتی ہیں۔ مشرقی یورپ پر ڈپلومیٹک دباؤ ڈالنے کے لئے اور اندرونی انتشار پیدا کرنے کی غرض سے ماسکو نے یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

تیسرا طریقہ کار بھی دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے تحت کبھی سازشوں سے کام لیا جاتا ہے کبھی حکومت کے اداروں میں گھس کر گڑبڑ مچائی جاتی ہے کبھی تخریبی کارروائیوں سے دہشت پھیلائی جاتی ہے۔ مقصد ایک ہی ہوتا ہے، یعنی غیر کمیونسٹ حکومت کو ختم کر دینا۔ اس اسلوب کار کی کلاسیکی مثال زیکوسلواکیہ ہے۔ بیسویں پارٹی کانگرس میں سوویت لیڈروں نے اعلان کیا کہ کمیونسٹ اب پارلیمانی ذرائع سے اقتدار حاصل کریں گے لیکن اگر حکومت پر قبضہ کرتے وقت کمیونسٹوں کو مقابلے اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے تو انھوں نے کمیونسٹوں کو انقلابی تشدد کی راہ اختیار کرنے سے نہیں روکا ہے۔ یہ

قابل توجہ ہے کہ کمیونسٹ نے اب تک آئینی طریقوں سے کہیں بھی اقتدار حاصل نہیں کیا ہے۔

کسی قانونی حکومت کا تختہ الٹنے یا تختہ الٹنے کی کوشش کرنے کا جو چوتھا انداز یہ ہے کہ کمیونسٹ "آزادی دلانے والی کمیٹی" یا اسی طرح کے کسی اور گروپ کو استعمال کیا جائے۔ عام طور پر یہ گروپ شکار ملک کے علاقائی کنٹرول کے باہر قائم ہوتے ہیں اور وہیں سے گڑبڑ پھیلاتے ہیں۔ یہ گروپ باہر ایک "آزاد حکومت" کی بنا ڈالتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اس حکومت کا اختیار سارے ملک پر ہے۔ پولینڈ میں بھی یہ نسخہ آزمایا گیا تھا۔ وہاں پہلے لبلن میں سوویت ہدایت کے تحت "قومی آزادی کی مجلس" بنائی گئی اس میں وہ پولستانی کمیونسٹ شامل تھے جو ایک عرصہ تک روس میں رہ چکے تھے۔ آہستہ آہستہ پولینڈ پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ کمیونسٹ پولینڈ میں لبلن کمیٹی کے ممبروں کو اونچے اونچے عہدے ملے۔

ان کے علاوہ بھی بے شمار حربے کمیونسٹ حضرات توسیع کمیونزم کے لئے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ طریقے ہیں: امداد، تجارت، ڈپلومیسی، جاسوسی، پروپیگنڈہ اور غدار عناصر کی تنظیم۔ ہم اس عمل کو "تخریب کی دوطرفہ مہم" کا نام دے سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اوپر سے کمیونسٹ بلاک نئے ترقی پذیر ملکوں پر دباؤ ڈال کر ان کی تخریب کرتا ہے اور اندر سے مقامی کمیونسٹ اور ان کے اتحادی تخریبی عمل کی تکمیل کرتے ہیں۔

سوویت حکومت اور حاشیہ بردار ممالک جو تجارتی مہمیں چلاتے رہتے ہیں وہ دراصل ماسکو کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ کچھ ملکوں میں انہیں معاشی بالادستی حاصل ہو جائے، کچھ ملکوں میں اہم معاشی اور سیاسی رعایتیں مل جائیں۔ کمیونسٹ بلاک اور غیر کمیونسٹ ملکوں کے درمیان جو تجارتی معاہدے ہوتے ہیں ان غیر کمیونسٹ ملکوں کو بڑی پرکشش شرطیں پیش کی جاتی ہیں مثلاً کم غیر مسابقتی شرح سود، طویل مدت میں قرض کی ادائیگی وغیرہ۔

سوویت یونین اور دیگر کمیونسٹ حکومتیں یہ سب کچھ اس لئے کرتی ہیں کہ تجارتی معاملات سے ان کا مقصد فوری نفع حاصل کرنا نہیں ہوتا بلکہ یہ خواہش پیش نظر ہوتی ہے کہ غیر کمیونسٹ ملکوں میں ان کا معاشی نفوذ بڑھے اور جو ممالک صنعتی طور پر پسماندہ ہیں ان پر حسب مراد اقتدار قائم ہو۔

تجارت کو سیاسی مقاصد کے لئے "کمیونزم کا ہتھیار" کس طرح بنایا جاتا ہے اس کی ایک مثال ایران کے معاملے میں ملتی ہے۔ وہاں سوویت یونین نے تجارت کی آڑ میں ایران کی کمیونسٹ تنظیم کو مالی مدد

پہنچائی لیکن اب تو خیر معاملہ یہ ہے کہ خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ دوسری مثال یوگوسلاویہ کی ہے۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب روس کی پروردہ کومن فارم سے یوگوسلاف کمیونسٹ پارٹی کے اخراج کو چند ہی مہینے گزرے تھے تو ماسکو نے اعلان کیا کہ ۱۹۴۹ء میں یوگوسلاویہ کے ساتھ اس کی تجارت ۱۹۴۸ء کے مقابلہ میں صرف آٹھواں حصہ رہے گی۔ حاشیہ بردار ملکوں نے بھی فوراً یہی راہ پکڑی لیکن ان سب کی یہ مشترکہ کوشش ناکام رہی کہ معاشی تنگیاں مسلط کر کے ٹیٹو کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے اور ایسی یوگوسلاف حکومت قائم کی جائے جو ماسکو کی اطاعت گزار ہو۔

تجارت کو معاشی نفوذ کا ذریعہ اور اقتصادی ہتھیار کے طور پر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اس کی ایک مثال افغانستان کا معاملہ ہے۔ اس ملک کو کمیونسٹ بلاک کے معاشی و سیاسی جال میں پھانسنے کے لئے سوویت شاطرانہ چالیں ۱۹۵۱ء میں شروع ہوئی تھیں۔ پہل اس طرح ہوئی کہ سوویت صنعتی ماہر اس غرض سے وہاں بھیجے گئے کہ اس "گوشہ نشین سلطنت" میں گیسولین کے ذخیروں کا سلسلہ تعمیر کریں۔ اس کے بعد سے سوویت حکومت نے افغانستان میں متعدد صنعتی کارخانے قائم کرنے کے لئے امداد دی۔ یہ امداد قرضوں کی صورت میں تھی جن کی ادائیگی افغانی مال کے ذریعہ ہونی تھی۔ ماسکو کی "امدادی اور تجارتی" پالیسیوں کے باعث افغانستان سوویت معاشی بندھنوں میں بری طرح جکڑا گیا اور کمیونسٹوں کے سیاسی جوڑ توڑ کے دام میں بری طرح پھنس گیا۔ ۱۹۵۵ء میں ہی یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ پانچ چھ سو سوویت شہری افغانستان میں موجود ہیں ان میں تعمیراتی محنت کش بھی ہیں اور ٹیکنیشین بھی ان میں اکثر افغانی زبان بولتے ہیں۔ کچھ سوویت ٹیکنیکل "مشیر" کمیونسٹ پروپیگنڈہ لٹریچر تقسیم کرتے ہوئے بھی پائے گئے۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ایک زیر تعمیر بلڈنگ میں کمیونسٹ نعرے نقش کر دیئے گئے اور بعد میں انہیں مٹانا پڑا۔

اس دوران میں غیر کمیونسٹ ملکوں سے افغانستان کی تجارت کم ہو گئی، تجارت اور تبادلے کے معاہدوں کے تحت اس کی پچاس فیصدی برآمدات روس پہنچنے لگیں۔ سوویت یونین سے درآمدات وہاں آہستہ آہستہ بڑھتی گئیں اور پھر وہ وقت آیا جب روسی فوجیں کمیونسٹ نور محمد ترہ کی کے ایما پر افغانستان میں در آئیں۔

جب کوئی غیر کمیونسٹ ملک ایک بار روس کے شکنجے میں آ جاتا ہے تو گویا وہ اپنے آپ کو اقتصادی

بلیک میل کے لئے ماسکو کے حوالہ کر دیتا ہے۔ روس اسے کسی وقت بھی ڈرا دھمکا سکتا ہے کہ اگر چینی کمیونسٹوں ——— کے سیاسی مقاصد پورے نہیں ہوئے تو تمام تجارت یکبارگی روک دی جائے گی۔ ایک ایسے ملک کے لئے جو پہلے ہی آزاد دنیا کے ملکوں سے اپنے بیشتر کاروباری رشتے توڑ چکا ہو یہ اچانک دھمکی تباہی کا پیام بن سکتی ہے۔

دوسرا زبردست حربہ پروپیگنڈہ ہے۔ آج کل نشر و اشاعت کا ہر ذریعہ، اثر و نفوذ کا ہر طریقہ کمیونسٹ چندی دنیا کو اس فریب میں مبتلا کرنے کے لئے کام میں لا رہے ہیں کہ امن کی منزل کے راہی بس وہی ہیں۔ وہ صلح پسند ہیں۔ جب کہ "سرمایہ دار جنگ باز" اپنے جارحانہ عزائم کو پروان چڑھانے میں منہمک ہیں۔ کمیونسٹوں کے زیر اثر جتنے اخبار، رسالے، ریڈیو اسٹیشن اور تقریری پلیٹ فارم ہیں سب میں ماسکو کی امن پسندی کے بلند بانگ دعووں کا راگ گایا جاتا ہے۔ ماسکو کی منعقد کی ہوئی عالمی کانفرنسیں بھی ایسی ہی قراردادوں پر بحث کرتی ہیں اور انہیں منظور کرتی رہتی ہیں جس میں سوویت امن پسندی کا ڈھول پیٹا گیا ہو۔ اس طرح ایک طرف کمیونسٹوں کی امن کی تحریکیں چلتی رہتی ہیں دوسری طرف وہ دنیا کے مختلف حصوں میں شورشیں اٹھاتے رہتے ہیں اور موقع ہو تو مسلح تصادم کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سی۔ پی۔ ایس۔ یو نے عالمی کمیونسٹ محاذ قائم کئے جو آج بھی دو رخی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ سوویت پروپیگنڈے کے نعروں کو دہراتے رہتے ہیں "خوفناک بموں پر پابندی لگاؤ" وغیرہ اور دوسری طرف جب کوریا، ہنگری اور تبت میں چینی سوویت بلاک کی طرف سے مسلح قوت کا استعمال ہوتا ہے تو چپ رہتے ہیں۔

ماسکو کے حقیقی ارادوں پر پردہ ڈالنے کے لئے روس جو قدم اٹھاتا ہے اسے جائز قرار دینے کی غرض سے سوویت پروپیگنڈہ الفاظ سے خوب کھیلتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرقی پولینڈ پر سرخ فوج کے حملے سے ایک دن پہلے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۹ء کو سوویت اخباروں میں اس قسم کی سرخیاں نظر آئیں "دنیا بھر کی قوموں کو مولوتوف کی یاد دہانی۔ روس لڑائی (دوسری عالمی جنگ) میں غیر جانبدار رہے گا"۔ سوویت حملے کے اگلے دن انہی اخباروں نے "پولینڈ میں" "آزادی کی سرخ فوج" کے داخلہ پر خوشیاں منائیں اور اعلان کیا کہ یہ سوویت اقدام "آزادی اور عالمی امن کی خدمت" تھا۔ جب جرمن نازیوں اور روسیوں نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا تو سوویت پریس نے فوراً ڈھنڈورا پیٹا "مشرقی یورپ میں

امن قائم ہو گیا ہے"۔ سوویت نقطۂ نظر کے مطابق کسی جھگڑے کا "پُرامن تصفیہ" اسے کہا جاتا ہے کہ یا تو اہم مسئلوں پر غیر کمیونسٹ حکومت ماسکو کی اطاعت قبول کرے یا قوت اور تخریبی کارروائیوں کے بل بوتے پر کمیونزم غلبہ پا لے۔

کمیونسٹ پروپیگنڈے کا اہتمام بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ روس اور کمیونسٹ چین کی حکومتیں اس کے لئے بڑی فراخدلی سے سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔ جن ملکوں میں کمیونسٹ پارٹی موجود ہے وہاں پارٹی بھی اس مقصد کے لئے روپیہ جمع کرتی ہے۔ کمیونسٹ لیڈرشپ پروپیگنڈے کو وہی درجہ دیتی ہے جو کمیونسٹ توسیعی منصوبے کے دوسرے ذرائع کو۔ ان کے نزدیک یہ اتنا ہی اہم ہے جتنی فوجی طاقت، ڈپلومیسی اور تخریبی چالیں۔ یہ مارکسزم لینزم کا بنیادی عنصر ہے۔ یہ نظریہ بجائے خود تبلیغی نظریات ہیں اور عوام کو اکساتے ہیں کہ تمام غیر کمیونسٹ حکومتوں کو، سارے جمے جمائے سماجی اداروں کو فنا کر دیا جائے لیکن آج کے سوویت پروپیگنڈے نے نیا چولا پہن لیا ہے۔ نظریاتی تبدیلی کے لئے اور دوسروں کو کمیونزم کا ہمنوا بنانے کے لئے یہ اب پرانی اصطلاحوں کا سہارا نہیں لیتا۔ "پرولتاریہ انقلاب" اور "پرولتاریہ کی آمریت" کی صدائیں اب سنائی نہیں دیتیں۔ ان کی جگہ پسماندہ اور نوآبادیاتی علاقوں میں کمیونسٹ ترجمانوں اور پروپیگنڈہ کرنے والوں نے نیا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ وہاں وہ "آزادی" "قوم پرستی" "زمین کسان کی" اور اسی قسم کی عوام کو اپیل کرنے والی دوسری باتوں کی تبلیغ کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت وہ موجودہ دور کے سب سے وسیع، سب سے جابر سوویت نوآبادیاتی نظام کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔

جن ملکوں میں صنعتی ترقی کا دور دورہ ہے وہاں کمیونسٹ مزدوروں کو بھڑکاتے ہیں اور جھگڑے پھیلاتے ہیں۔ اس سے ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ سیاسی فائدے حاصل ہوں اور کمیونسٹ پارٹی کے لئے ممبر بنانا ان کا مدعا ہوتا ہے۔ مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کی انہیں کوئی فکر نہیں ہوتی۔ وہ مزدوروں کو قومیائی ہوئی صنعتوں کے سبز باغ دکھاتے ہیں۔ انہیں لالچ دیتے ہیں کہ "ذرائع پیداوار مزدوروں کی ملکیت ہوں گے۔"

نوجوانوں کو ورغلانے کے لئے کمیونسٹ پروپیگنڈہ کرنے والے عجیب عجیب ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے نوجوانوں کے عالمی میلے کئی مرتبہ بڑی دھوم دھام سے منائے جا چکے ہیں

ان کا اہتمام کرنے والے دو بین الاقوامی کمیونسٹ محاذی ادارے ہیں: جمہوری نوجوانوں کی عالمی فیڈریشن (W.F.D.Y) اور طلبہ کی بین الاقوامی یونین (I.U.S)۔ ڈھنڈورا تو یہ پیٹا جاتا ہے کہ یہ میلے قطعی غیر سیاسی تقریبیں ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عظیم الشان تشہیری تماشے بن کر رہ جاتی ہیں۔ کار آزمودہ کمیونسٹ یہ تماشے رچاتے ہیں۔ روس کی ہدایت کے تحت ان کا انتظام ہوتا ہے۔

نوجوانوں کا چھٹا عالمی میلہ ۱۹۵۷ء میں ماسکو میں ہوا تھا۔ تقریباً ۳۴۰۰۰ نوجوانوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ امن اور دوستی کے لئے نوجوانوں اور طالب علموں کا ساتواں عالمی میلہ ویانا میں ہوا اور ۲۶ جولائی سے ۴ اگست ۱۹۵۹ء تک ہوتا رہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایسی تقریب آہنی پردے کے باہر کسی ملک میں منائی گئی۔ ان میلوں کی اصلی روح یہیں بے نقاب ہوئی کیونکہ یہاں دل کھول کر کمیونسٹ نظریوں کی تبلیغ کی گئی اور انہیں دوسروں پر ٹھونسنے کی کوششیں ہوئیں۔

اب آیئے کمیونسٹ پھیلاؤ کے مختلف مراحل پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے مقبوضہ ممالک کو کن حربوں سے اپنایا ہے۔ ۱۹۳۹ء کے اسٹالن ہٹلر معاہدے سے سوویت یونین کو مشرقی پولینڈ پر قبضہ کرنے اور اس کا الحاق کرنے کا اختیار مل گیا۔ اس جارحانہ اقدام کے بعد روس نے تین بالٹک جمہوریتیں لتھوانیا، ایسٹونیا اور لیٹویا کا الحاق کر لیا۔ اس کے بعد روس نے رومانیہ کو بہت سا علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ فن لینڈ اپنے شہ زور پڑوسی سے لڑائی میں ہار چکا تھا۔ وہ بھی جنگی اہمیت کے علاقوں سے روس کے حق میں دستبردار ہو گیا اور شمال بعید کے ایک ضلع سے جو کریلیا کا حصہ تھا، ہاتھ دھو بیٹھا جسے روس نے اپنے ساتھ ملا لیا۔

دوسری جنگ عظیم ابھی برپا تھی کہ کریملن نے داؤ پیچ کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا جس کی بدولت کمیونسٹ اقلیتیں مشرقی یورپ کی سرحدی ریاستوں کی حاکم بن گئیں۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان پولینڈ، زیکوسلواکیہ، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ اور البانیہ میں روس کی کٹھ پتلی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ برلن کا سوویت علاقہ اور مشرقی جرمنی بھی ماسکو کے زیر اقتدار آ گئے۔ ۱۹۴۶ء میں یوگوسلاویہ پر مارشل ٹیٹو کی قیادت میں کمیونسٹوں کی حکومت ہو گئی۔

ادھر شمالی کوریا پر جو سوویت فوجیں قابض تھیں انھوں نے وہاں ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی۔ چینی کمیونسٹوں کو جو روس کی فوجی امداد ملی تو وہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۴۹ء میں پورے چینی برصغیر پر

پھیل گئے۔ شمالی ویت نام کی مدد کمیونسٹ چین نے کی اور نتیجۃً وہاں بھی کمیونسٹ حکومت وجود میں آ گئی۔ ۱۹۴۲ء کے بعد سے ایک کروڑ چالیس لاکھ مربع میل علاقہ (جس میں ستر کروڑ کی انسانی آبادی) کمیونسٹوں کے تسلط میں آ گیا ہے۔ یہ سارا علاقہ کچھ تو ہتھیاروں کی مدد سے اور کچھ سازش، تخریب اور دہشت کا جال پھیلا کر ہتھیا گیا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں پیکنگ کے پھیلنے اور بڑھنے کی حرص پھر بے نقاب ہوئی۔ اس نے تبت کی داخلی خودمختاری چھین لی، ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر اپنا حق جتانا شروع کیا اور جنوبی مشرقی ایشیا کے لئے مستقل خطرہ بن گیا۔

مشرقی یورپ میں حکومت اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے کمیونسٹوں نے کچھ دوسری ہی چالیں استعمال کیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مغربی جمہوریتیں تیزی سے اپنی مسلح فوجوں کو خدمت سے سبکدوش کر رہی تھیں تاکہ یہ لاکھوں نوجوان سپاہی پر امن مشغلوں کے لئے اپنے اپنے مقام پر واپس پہنچ جائیں، اور حکومتیں جنگ کی لائی ہوئی تباہی کا اثر دور کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔

لیکن سوویت یونین نے اپنی فوجوں کو سبکدوش نہیں کیا بلکہ پورے مشرقی یورپ پر انھیں پھیلا دیا۔ کہیں وہ قابض دستوں کی شکل میں موجود تھیں، کہیں سرحدوں پر تعینات تھیں اور آزاد حکومتوں کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ سرخ فوج دراصل ایک اور سوویت "فوج" کی مسلح پشت پناہی کر رہی تھی۔ اس دوسری فوج میں کمیونسٹ ایجنٹ، خفیہ پولیس کے سپاہی، دہشت پسند، کمیونسٹ سازشی جو متعلقہ ملکوں ہی کے رہنے والے تھے، سب شامل تھے۔ آہستہ آہستہ اس "فوج" نے سارے ملکوں کو نگل ڈالا۔

اسی طرح کمیونسٹوں نے اقتدار کے حصول کے لئے مختلف عہدوں کو بھی آلۂ کار بنایا۔ کمیونسٹوں نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ کلیدی عہدے ان کی پارٹی کے ممبروں یا ہمدردوں کے پاس آ جائیں۔ وزارت داخلہ جو خفیہ پولیس پر کنٹرول رکھتی ہے، وزارت انصاف جس کا عدالتوں پر تسلط ہے اور وزارت اطلاعات جو پریس، ریڈیو وغیرہ کی نگران ہے ایسے ہی اہم عہدے تھے۔ کمیونسٹوں نے پہلے ان ہی عہدوں پر قبضہ کیا۔ ضبط کی ہوئی زمین کی تقسیم کے سلسلہ میں وزارت زراعت کو اپنے ہاتھ میں رکھنا بھی کمیونسٹوں کے نزدیک ضروری تھا۔ حکومت کی وزارتوں اور محکموں کے علاوہ ٹریڈ یونینزم کا میدان بھی کمیونسٹوں کے لئے کچھ کم اہم نہ تھا جہاں وہ یونینوں میں کسی نہ کسی طرح گھس کر اپنا دست بنا لیتے تھے اور پھر ان پر پوری طرح

چھا جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ انہیں سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

سیاسی اور فوجی دباؤ تو کمیونسٹوں کا خاص ہتھیار رہا ہے۔ بالشویک انقلاب کے بعد ہی سے سوویٹ سرحدوں سے باہر مشرق بعید میں روس اپنا سیاسی اور فوجی دباؤ ڈالتا رہا ہے۔ چینی بیرونی منگولیا میں سوویٹ نفوذ کا سلسلہ ۱۹۲۰ء کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں سوویٹ نگرانی کے تحت ماسکو کے تربیت یافتہ منگول کمیونسٹوں نے "منگول عوامی جمہوریہ" قائم کی۔ ۱۹۴۵ء تک روس بیرونی منگولیا پر چین کی بالادستی تسلیم کرتا رہا لیکن پھر اس نے "استصواب" کا سوانگ رچایا۔ اس کے بعد چین سے منگولیا کی علیحدگی اور آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ جمہوریہ آج روس کی "نیم نوآبادی" ہے۔

تنو ٹووا جو بیرونی منگولیہ سے ملا ہوا تھا پہلے چین کا حصہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد وہ بھی سوویٹ نفوذ کا اسی طرح نشانہ بنا۔ ۱۹۴۴ء میں روس نے اس کا الحاق کر لیا اور یہ "تووین خود مختار علاقہ" کہلانے لگا۔ اسے کٹھ پتلی اسٹیٹ کا درجہ بھی نہیں عطا کیا گیا۔ چین کا صوبہ سنکیانگ بھی شروع میں سوویٹ توسیع پسندی کی منزلوں میں سے ایک تھا لیکن ۱۹۵۴ء کے آخر میں روس وہاں اپنے معاشی مفاد کو چین کے حق میں چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔

کمیونسٹ لوگ آزاد دنیا کے ملکوں میں مارکسزم لینن ازم پھیلانے کے لئے سیاسی اداروں کے علاوہ کچھ دوسرے اداروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اپنے نظریات کی تبلیغ کی کمیونسٹ متحدہ "محاذوں" اور اداروں کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ اصلاحی تحریکوں میں بھی پہنچ جاتے ہیں اور ان پر اپنا رنگ جما کر ان سے اپنے سیاسی اور نظریاتی مقاصد پورے کرنے کا کام لیتے ہیں۔ "لینن ازم کی بنیادیں" میں اسٹالن نے لکھا تھا "بورژوا نظام کے تحت انقلابی لگاتوں میں اصلاحی تحریکیں بھی شامل ہیں، انہی سے اس نظام کی شکست و ریخت ہوتی ہے، ان ہی سے انقلاب کو تقویت ملتی ہے۔"

کبھی کبھی کمیونسٹ پسپائی بھی اختیار کر لیتے ہیں لیکن یہ پسپائی ایک نئے حملہ کا پیش خیمہ ہوتی ہے "سی پی ایس یو کی مختصر تاریخ" میں تحریر ہے کہ اکتوبر کے انقلاب کے زمانے میں لینن نے پارٹی کو سکھایا، اگر حالات سازگار ہوں تو کس طرح عزم اور حوصلہ کے ساتھ نڈر ہو کر آگے بڑھا جائے۔ بریسٹ لٹووسک صلح کے دور میں، جب روس جرمنی کو دوسرے علاقے دینے پر مجبور ہوا، لینن نے پارٹی کو راہ دکھائی کہ جب دشمن ہم سے قوی ہو تو کس طرح خوش اسلوبی سے پسپائی اختیار کی جائے

اور اس کے بعد نئے حملے کے لئے پوری قوت کے ساتھ تیاری کی جائے۔" اس طرح اگر دباؤ شدید ہو اور کمیونزم نہ تو اس پر غالب آ سکے نہ اس کی خاطر خواہ مزاحمت کر سکے تو وقتی طور پر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے لیکن یہ پسپائی عارضی ہوتی ہے۔ اس وقفہ کو وہ نئے حملہ کی تیاریوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔

آخر میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کمیونسٹ "پُرامن بقائے باہم" کی جو اصطلاح استعمال کرتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ کمیونزم یا تو جنگ سے فروغ اور غلبہ پاتا ہے یا پُرامن ذرائع سے۔ پُرامن ذرائع سے کمیونزم کی فتح اسی صورت میں ممکن ہے جب سرمایہ دار فرداً فرداً کمیونسٹ کیمپ کے مطالبوں کے سامنے بغیر مزاحمت کے جھک جائیں۔ سوویٹ لیڈر جب "پُرامن بقائے باہم" کا راگ گاتے ہیں تو ان کا منشا بھی اطاعت طلبی ہوتا ہے۔

۱۹۲۹ء میں لینن نے اعلان کیا کہ یہ تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سوویٹ جمہوریہ کے پہلو بہ پہلو سامراجی ریاستیں طویل عرصہ تک موجود رہیں گی۔ آخر ان میں سے کسی ایک کو فتح یاب ہونا ہے۔ دوسری پھر باقی بھی رہے گی۔ اس انجام سے پہلے سوویٹ جمہوریہ اور بورژوا ریاستوں کے درمیان خوفناک ٹکراؤ ہوتا رہے گا۔" ۱۹۳۱ء میں شروع ہونے والے جارحانہ اقدامات کے ایک طویل سلسلہ کے بعد اسٹالن نے اپنے ترجمان جارجی مالنکوف کے ذریعہ ۱۹۵۲ء میں دنیا کو یقین دلایا کہ سوویٹ یونین "سرمایہ داری سے پُرامن مقابلے" کے سوا کچھ نہیں چاہتی۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں کہ اپنا نظریہ حیات یا اپنا اقتصادی نظام کسی پر جبراً مسلط کرے۔"

فروری ۱۹۵۶ء میں سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس میں پارٹی سکریٹری نکیتا خروشچیف نے بھی کچھ اسی انداز میں کہا "یہ سوچنا مضحکہ خیز ہے کہ انقلابات آرڈر دینے پر تیار ہوتے ہیں۔" لیکن مشرقی یورپ میں ۴۸-۱۹۴۶ء کے انقلابات "آرڈر" کے مطابق ہی تیار ہوتے تھے حکم دینے والے ماسکو، اس کے ایجنٹ اور پٹھو تھے۔

اس لئے آج سوویٹ "اجتماعی لیڈرشپ" اگرچہ پُرامن مقابلہ پر زور دے رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے بہت سے حصوں میں کمیونسٹوں کی تخریبی سرگرمیاں جاری ہیں تو اسے بھی کمیونسٹوں کی حکمت عملی اور مصلحت سمجھنا چاہئے جسے ضرورت نے جنم دیا ہے اور جو کسی بھی لمحہ بدل سکتی ہے۔ یہ سوویٹ تصور امن کوئی حال کی ایجاد نہیں ہے بلکہ بالشویک انقلاب کے بعد ہی سے سوویٹ

لیڈر "امن" کا ڈھول پیٹتے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی ہوس ملک گیری کا مظاہرہ بھی ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے چھوٹے پڑوسیوں کو رفتہ رفتہ ہڑپ کر کے اپنی قلمرو کو وسعت دی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے حسب ضرورت اور حسب منشا مسلح قوت، سازش اور تخریب سبھی سے کام لیا ہے۔

کمیونسٹوں کے نزدیک امن کا کیا تصور ہے؟ اسے لینن کے ایک بیان سے سمجھئے۔ ۱۹۰۷ء میں لینن نے لکھا تھا "اگر کوئی منصوبہ امن عوام کو انقلاب کی ضرورت اور اہمیت نہیں جتاتا، انقلاب کی عوامی جدوجہد کا ساتھ دینے حمایت کرنے اور اسے آگے بڑھانے سے دامن بچاتا ہے تو وہ عوام کے لئے دھوکا ہے، منافقت کا پردہ ہے۔"

۱۹۲۸ء میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی عالمی کانگریس میں امن کے معاملے میں سوویت پالیسی کی وضاحت اس طرح کی گئی: روس کی بین الاقوامی پالیسی امن کی پالیسی ہے، یہ سوویت روس کے حکمران طبقہ، پرولتاریہ کے مفاد کو پیش نظر رکھتی ہے۔ پرولتاری آمریت کے سارے حامیوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرتی ہے۔ سامراجی ملکوں کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ پالیسی بہترین بنیاد ہے۔

"اس پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ بین الاقوامی انقلاب کی حفاظت کرے اور سوشلزم کی تعمیر کی جدوجہد کو رکاوٹوں سے محفوظ رکھے کیونکہ سوشلزم کے غلبے سے دنیا میں نیا انقلاب بپا ہوگا۔ اس پالیسی کا مدعا یہ ہے کہ سامراج سے مسلح ٹکراؤ جتنی مدت تک ممکن ہو، نہ ہونے پائے۔"

آخر میں اگر یہ نہ بتایا جائے کہ کمیونسٹوں کے ان حربوں کا توڑ کس طرح کیا جائے تو مضمون یقیناً تشنہ رہ جاتا ہے۔ کمیونزم کا مقابلہ کیسے کیا جائے، یہ ایک اہم سوال ہے۔ اس سوال کا کوئی ایک جواب نہیں ہو سکتا کیونکہ کمیونزم کے خطرے کے بہت سے رخ ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کمیونزم کبھی تخریبی کارروائیوں کو اپناتا ہے، کبھی طاقت کا سہارا لیتا ہے۔ کبھی ان تینوں طریقوں کے آمیزے کو ہتھیار بناتا ہے۔ اپنی سازشی سرگرمیوں کے فروغ کے لئے اور انہیں چھپانے کے لئے پریس اور ریڈیو کے واسطے سے یا بزبانی ذرائع کمیونسٹ پروپیگنڈہ کی لہر ہر دم رواں رہتی ہے۔ کمیونزم کا سب سے مؤثر پروپیگنڈہ "محاذی ادارے" کرتے ہیں، بظاہر یہ گروپ معصوم اور بے ضرر ہوتے ہیں لیکن ان کی باگ ڈور کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جیسا کہ ان کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔

کمیونزم کا خطرہ جہاں کہیں بھی موجود ہو وہاں آزادی کے خلاف اس کے داؤں اور یورش کو روکنے کے لئے

جوابی اقدام کا منصوبہ تیار رکھنا چاہئے۔ اس خطرہ کو دور بھگانے کے لئے ایک ہتھیار تو بہت ضروری ہے اور وہ ہے سچائی سے آگاہی۔ اس لئے جو لوگ اس خطرے کو ختم کرنے پر کمر بستہ ہوں انہیں پہلے اس کی نوعیت سے بخوبی واقف ہونا چاہئے۔ انہیں علم ہونا چاہئے کہ کمیونزم اپنے رضامند یا نا شعور شکاروں پر کون سے حربے اور کون سی چالیں آزماتا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ہر وقت یہ کوشش جاری رکھنی چاہئے کہ کمیونزم کے خطرہ کے خلاف اس کے سارے مخالف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

بین الاقوامی کمیونسٹ محاذی اداروں کا کچھ مطالعہ کرنا ہے جو توسیع کمیونزم میں دور رس اثر رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جب دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ ہوا اور اقوام متحدہ کی بنا پڑی تو سوویت اجتماع کے تحت بین الاقوامی کمیونسٹ محاذی اداروں کے سلسلہ کی پہلی کڑی بھی ظہور میں آئی۔ ۱۹۵۳ء تک اس طرح کے تیرہ محاذ بن چکے تھے۔ انہیں اس لئے بنایا گیا تھا کہ کمیونسٹ پروپیگنڈہ پھیلائیں۔ چینی سوویت بلاک کی خارجہ پالیسی کی حمایت کریں اور ایسے آدمیوں کو بھی جو کمیونسٹ نہ ہوں، جو ان کی اصل غایت سے واقف نہ ہوں، ورغلائیں اور کمیونسٹوں اور ان کے رفقائے سفر کے ساتھ اشتراک پر آمادہ کرلیں۔ ۱۹۴۵ء میں قائم ہونے والے تین کمیونسٹ محاذ یہ تھے: ٹریڈ یونینوں کی عالمی فیڈریشن (ڈبلیو۔ ایف۔ ٹی۔ یو)، جمہوری نوجوانوں کی عالمی فیڈریشن (ڈبلیو۔ ایف۔ ڈی۔ وائی) اور عورتوں کی بین الاقوامی جمہوری فیڈریشن (ڈبلیو۔ آئی۔ ڈی۔ ایف)۔

اگلے سال پانچ محاذ اور بنے۔ طلبہ کی بین الاقوامی یونین (آئی۔ یو۔ ایس)، اساتذہ کی یونینوں کی عالمی فیڈریشن (ایف۔ آئی۔ ایس۔ ای)، جمہوری قانون دانوں کی بین الاقوامی انجمن (آئی۔ اے۔ ڈی۔ ایل)، صحافیوں کی بین الاقوامی تنظیم (آئی۔ او۔ جے) اور بین الاقوامی نشری تنظیم (او۔ آئی۔ آر)۔ ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹ پروپیگنڈے کا سب سے طاقتور ادارہ عالمی امن کونسل (ڈبلیو۔ پی۔ سی) قائم ہوا۔ ۱۹۵۰ء کے شروع میں چار اور چھوٹے چھوٹے محاذ بنائے گئے۔

ان بین الاقوامی محاذوں سے بے شمار قومی اور مقامی گروپ ملحق ہوتے ہیں ان میں سے بہت تو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ ان محاذوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے کروڑوں ممبر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تعداد کا اسی فیصد محض چینی سوویت بلاک میں رہنے والے ممبروں پر مشتمل ہے جہاں منتخب تنظیموں اور پیشہ ور گروہوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسٹیٹ کی چلائی ہوئی یونینوں میں شامل ہوں۔

ہر محاذ کا انتظام بلا استثنا کمیونسٹوں اور ان کے رفقائے سفر پر مشتمل عاملہ کمیٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جمہوری انتخابات کا طریقہ کسی محاذ میں رائج نہیں۔ محاذی جلسوں کی تمام کارروائیاں اور قراردادیں بااقتدار طبقہ پہلے سے

طے کر لیتے ہیں۔ ان میں "کمیونزم" کی گونج ہوتی ہے۔ ہنگری میں سوویت مداخلت کے بعد سے مغربی یورپ وغیرہ دوسری جگہوں کے محاذ اپنے ممبر اور پارٹی وقار کھو بیٹھے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو منظر کشی کے اندر ہنگری کے مسئلہ پر خاصا ٹکراؤ بھی ہوا۔ تبھی عوام پر جو ظلم کمیونسٹوں نے کئے ان کی مذمت کسی محاذ نے نہیں کی۔

ان تمام کمیونسٹ محاذی اداروں سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہر کمیونسٹ محاذی ادارے کو اچھی طرح پہچان لیا جائے کہ اس طرح کہ شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ اس کے بعد بر سر عام یہ ظاہر کر دینا چاہئے کہ یہ ادارہ کمیونسٹوں کا آلہ کار ہے۔ اس کی تشکیل اس لئے ہوئی ہے کہ کمیونسٹ اس محاذ کی حمایت کا طالب ہوتا ہے، انہی پر بیرونی کنٹرول مسلط کر دے۔ عام طور پر یہ پردہ دری ہی کافی ہوتی ہے۔ جو لوگ دھوکے میں آکر محاذ میں شامل ہو بیٹھے تھے، اپنی ممبری ختم کرنے لگتے ہیں اور مالی امداد بند کر دیتے ہیں۔ ممبروں کے بغیر یہ محاذ پہلے گمنامی اور پھر عدم کی راہ لیتا ہے۔

جن لوگوں نے تعلیم دینے کو پیشہ اختیار کر رکھا ہے ان پر یہ خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنے شاگردوں کو کمیونسٹ اثرات سے بچائے رکھیں کیونکہ بین الاقوامی کمیونزم اپنے فروغ کے لئے نئی نسل کو ورغلانے پر بہت زور دیتا ہے۔ فلپائن کے ڈپلومیٹ و سیاستدان کارلوس پی رومولو نے اپنی کتاب "ایشیا میں جہاد" میں لکھا ہے: "کمیونسٹوں نے ساری دنیا میں ایک ہی خفیہ انداز اختیار کر رکھا تھا۔ بچوں اور نوجوانوں کو پھانسو، وہ کل کے رہنما ہیں، وہ ہماری نئی نسل کی روح ہیں۔ کمیونزم کا مدعا آج بھی بدلا نہیں ہے۔ دنیا بھر کے نوجوانوں پر ان کی نگاہ ہے۔ انہیں بگاڑنا ان کی منزل ہے۔ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہ بچوں کو بھی کمیونزم کی تبلیغ کرتے ہیں۔"

کمیونزم کے مخالف دشمنی میں فوجی اور شہری دونوں ہی شامل ہیں اور ان سے چھین اور کوریا کی ویت نام میں لڑنے والے جنگجو بہت دکھ سہ چکے ہیں۔ الفوٹ تھیا وونٹ کی ترقی دی ہے۔ کروڑوں ایسے بھی ہیں جو مغلوب ہوتے رہے، غریبی کی ارزانی تشدد کی تیز دھند کی سختیاں اٹھائیں لیکن کمیونسٹوں کی دھمکیوں یا ترغیبات کے آگے جھکنا منظور نہ کیا۔ ان کی مثال سے ہر عام شہری کو حوصلہ ملنا چاہئے کہ اس راہ میں جو ایثار و قربانی بھی ضروری ہو پیش کرے، ورنہ کمیونزم کے عذاب سے دنیا کو نجات دلانا ممکن نہیں۔ کمیونزم کے خطرے کو روکنے کے لئے بڑی ہوشیاری اور مستعدی درکار ہے۔ کمیونسٹ چالوں سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے اور آزادی کے لئے کام کرنے کا عزم اتنا ہی پرجوش جذبہ مطلوب ہے جو دنیا کے عوام کو غلام بنانے کے لئے کمیونسٹوں میں پایا جاتا ہے۔

کمیونسٹوں کی دغابازی اور حربے جن کا ذکر ہو چکا، ان سب کی حد درجہ ذیل ہدایت سے ہوتی ہے، لینن کہتا ہے:

"کمیونسٹوں کو ہر قسم کی قربانی کیلئے تیار رہنا چاہئے اور اگر ضرورت پڑے تو ہر قسم کی چالاکی و عیاری سے کام لینا چاہئے۔ انہیں غیر قانونی طریقے اختیار کرنے، صداقت کی پردہ پوشی اور اس سے پہلو تہی کی تمام چالیں استعمال کرنی چاہئیں تاکہ وہ ٹریڈ یونینوں میں نفوذ حاصل کر سکیں، ان میں رہ سکیں اور اپنی انقلابی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔" ●●

(لینن کی مجموعی تحریریں، جلد ۱۷، صفحہ ۱۴۲)

تعارف و تبصرہ

بابری مسجد اور ہندوستانی مسلمان

مصنف: راشد شاذ
ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف مسلم افیئرز
پی او بکس ۷۷
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ انڈیا

راشد صاحب کی یہ تصنیف گرچہ مختصر ہے لیکن ہر لحاظ سے جامع اور ہر خاص و عام کی تشنگی بجھانے کے لئے ایک حد تک کافی ہے۔ مصنف نے بڑی محنت اور لگن سے اس کتابچے کو تیار کیا ہے۔ زبان سادہ و عام فہم ہے۔ جملوں میں سلاست و روانی ہے۔ اپنے ورکی روداد کو بہت ہی نرالے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ موقع کی مناسبت سے مثالوں کو اس انداز سے پیش کیا ہے گویا استاذ یہ بات اپنے شاگرد کے دل میں مختلف مثالوں سے اتارنا چاہتا ہو۔ اس طرز تحریر سے راشد صاحب کی شخصیت اجاگر ہو جاتی ہے لیکن چند باتیں کھٹک رہی ہیں جن کو سامنے لا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ کہ کتاب کے الفاظ اور جملے قدرے جذباتی ہو گئے ہیں اگر یہ باتیں کچھ نرم انداز سے کہی گئی ہوتیں تو عوام کیلئے زیادہ مفید ثابت ہوتیں۔ جذباتی تقریر و تحریر سے اگر عوام کے جذبات بھڑک اٹھے تو وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے پر آمادہ ہو جائیں گے جو ایک امت وسط کیلئے نہایت خطرناک ہے اور صراط مستقیم سے ہٹا دینے والی بات ہوگی، اور پھر ہم مسلمان اپنے ہم وطنوں کے درمیان دین کا کام کرنے سے قاصر رہیں گے۔ ان کے دلوں میں ہمارے خلاف بغض و دشمنی پیدا ہو جائے گی جس کی بنا پر دونوں طرف کے بے گناہ لوگوں کی جانیں ضائع ہوں گی، اور باہم آپس میں دوری پیدا ہو جائے گی جس کا دور کرنا مشکل ہوگا۔ ہماری تقریر ہو کہ تحریر، جہاں اس میں محمود اعتماد اور سنجیدگی و متانت کے ساتھ عقلی و نقلی دلائل و شواہد کا انبار ہو وہیں اس کی سطر سطر سے اور اس کے لفظ لفظ سے محبت کی بو آتی ہو کہ بات دلوں میں اترتی چلی جائے اور سوائے ضد اور ہٹ دھرمی کے کوئی چیز اسے قبول کرنے میں مانع نہ ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کتابچے کے نام کی مناسبت سے اس کے شروع میں بابری مسجد کی تاریخ اور مختصر تفصیل ہونی چاہئے تھی تاکہ قاری اس کے متعلق بخوبی واقف ہو سکے۔ عام طور سے لوگ اس کی اصل تاریخ سے ناواقف ہیں۔

محمد عمران خان، استاذ جامعہ

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

ایڈیٹر حیاتِ نو کو الوداعی پارٹی

برادرم طارق فارقلیط صاحب کا ایس۔آئی۔او یوپی کے زونل صدر کی حیثیت سے انتخاب ہو چکا تھا اور انھیں اس کے لئے لکھنؤ منتقل ہونا تھا۔ ۱۸؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کی صبح بڑی سرد تھی۔ کئی روز سے مسلسل دن و رات بارش ہو رہی تھی، ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے پریشان کر رہے تھے۔ اسی دن صبح میں سات بجے کے قریب انجمن نے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔ ناشتہ کے بعد سکریٹری انجمن برادرم جاوید اشرف فلاحی حاضرین کی توجہ کا مرکز بنے۔ انھوں نے کہا "طارق فارقلیط صاحب ایس۔آئی۔او کے زونل صدر منتخب ہو چکے ہیں، چند ماہ سے "حیاتِ نو" کو موصوف نے سنبھالا تھا۔ باقاعدگی کے ساتھ یہ پرچہ نکلتا رہا، میرا تاثر ہے کہ اس پرچے نے یہاں بھی اور باہر بھی پہلے کی نسبت زیادہ بہتر مقام حاصل کیا تھا۔ برادرم سے التماس ہے کہ جانے کے بعد بھی اس کو یاد رکھیں گے۔ مضامین اور مشورے وغیرہ سے نوازتے رہیں گے۔ ہم لوگوں کی جانب سے اگر کوئی نامناسب بات سرزد ہوئی ہو تو اسے درگزر فرمائیں گے۔ آج اگر ایک طرف ہم انھیں الوداع کہہ رہے ہیں تو دوسری جانب مبارکباد بھی پیش کر رہے ہیں۔"

جاوید اشرف صاحب خاموش ہوئے تو حاضرین کی نظریں برادرم مکرم مطیع اللہ صاحب کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ آپ اپنے مخصوص انداز میں بولے "سبھی کو افسوس اور مسرت ہے۔ ہم ہی لوگوں نے انھیں بلایا تھا جب کہ یہ بہت دور جا چکے تھے، یہ پرچہ بند تھا۔ ایسے آدمی کی تلاش تھی جو یکسوئی سے مسلسل نکال سکے اور پھر یہ پرچہ بند ہو۔ "حیاتِ نو" کی تاریخ میں پہلی بار یہ اتنی باقاعدگی سے نکلا لیکن یہ پہلو خوش آئند اور وجہ تسکین ہے کہ اسی مقصد کی خاطر جس کے لئے جامعہ کی پہلی اینٹ رکھی گئی تھی اور اس کا قیام عمل میں آیا تھا، برادرم ایک دائرے سے نکل کر نسبتاً اس سے وسیع تر دائرہ میں جا رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ انجمن اور جامعہ کو یاد رکھیں گے۔ وقتاً فوقتاً مادرِ علمی کی زیارت کرتے رہیں گے۔ خدا ہمیں اور موصوف کو اپنے اپنے میدان میں

اقامتِ دین کے لئے زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔"

موجود دوسرے ساتھیوں کے بھی یہی تاثرات و جذبات تھے۔ اب برادرم طارق فارقلیط صاحب کی باری تھی۔ وہ اٹھے اور اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا "آپ لوگوں کو چھوڑتے ہوئے، اس ماحول کو چھوڑتے ہوئے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو تکلیف نہ ہو۔ مجھے بھی اس تکلیف اور درد کا احساس ہے لیکن میرے لئے یہ چیز اطمینان کی باعث ہے کہ تاک جہاں میں پہلے تھا، پھر یہاں آیا اور اب جہاں جا رہا ہوں، ہر جگہ ایک ہی مقصد پیشِ نظر رہا ہے اور رہے گا، صرف پلیٹ فارم بدلا ہوا ہے۔ آئندہ انجمن یا جامعہ نے یاد کیا تو میں ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔" انھوں نے پیش کش بھی کی کہ "اگر مدرستہ حیاتِ نو کا انتظام نہ ہو سکے تو تین چار ماہ تک لکھنؤ رہ کر بھی میں ایڈیٹ کر سکتا ہوں۔" یہ پیش کش حیاتِ نو سے ان کے دلی لگاؤ کا ایک بین ثبوت ہے۔ مزید فرمایا "ہماری منزل ایک، ہم ایک ہی راہ کے راہی اور ہم سب کا ایک ہی مقصد اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ انجمن کو سوچنا چاہئے کہ ہمارے جماعت کی بہترین گوہر بنے سے کیسے بچیں اور کس طریقے سے ان کی صلاحیتیں اس مقصد کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال ہوں۔" آخر میں پارٹی کے اہتمام پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "جامعہ اور انجمن کے مفادات کو میں ترجیح دیتا رہا ہوں، آئندہ بھی دیتا رہوں گا، انشاء اللہ۔ یہاں تین سال کی مدت میں رہتے ہوئے اگر کسی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو متوقع ہوں کہ فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے آپ معاف کریں گے۔"

جامعہ کے تین اساتذہ کو صدمہ

ادارہ بڑے درد کے ساتھ تین وفات ساتھیوں کی اطلاع دیتا ہے۔ مولانا احسان الحق صاحب فلاحی کے والد بزرگوار جناب حاجی شمس الدین صاحب ستر سال کی عمر میں ۳۰؍ستمبر ۱۹۸۷ء کو کم و بیش ایک ماہ کی علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ مرحوم صوم و صلوٰۃ کے پابند اور حلال و حرام کا خیال رکھنے والے تھے۔ ایسے وقت میں جبکہ مئو آئمہ میں تحریکِ اسلامی کا نام لینا ایک جرم سمجھا جاتا تھا وہ تحریکِ اسلامی سے ہمدردی کرتے رہے اور اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لئے تحریکی درسگاہ کا انتخاب کیا۔

جناب ماسٹر عبدالمالک صاحب استاذ جامعہ کی والدہ محترمہ ۲۸؍اکتوبر ۱۹۸۷ء کو ایک ماہ بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مرحومہ بڑی مہمان نواز اور خدا ترس خاتون تھیں۔ آخری لمحات بڑے قابلِ رشک تھے۔ انھیں جامعہ سے متصل قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

مولانا اظہار احمد صاحب فلاحی کے والد محترم جناب [illegible] صاحب کا ۳۰ر نومبر ۱۹۸۷ء کی شام میں انتقال ہوگیا، مرحوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیندار اور کافی ملنسار بزرگ تھے، نیز مسلم و غیر مسلم دونوں ہی میں ہردلعزیز تھے۔

خدا ان سب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

شوریٰ کا اجلاس

۲۹، ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۷ء کو انجمن کی شوریٰ کا اجلاس ہوا جو دو دنوں تک چلتا رہا جس کی مختصر روداد سکریٹری انجمن کے قلم سے اسی شمارہ میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

ہمدردانِ جامعہ کی ایک میٹنگ

۱۲ر نومبر ۱۹۸۷ء کو مولانا شبیر احمد صاحب فلاحی کی تحریک پر جمدا گنج کے ہمدردان و بہی خواہوں کی میٹنگ جامعہ کی مسجد میں ہوئی۔ اس مجلس میں دیگر منتظمین کے ساتھ ناظم جامعہ اور معتمد مال بھی شریک تھے۔ اس کا آغاز جناب شیخ عبد المتین صاحب کی صدارت میں عزیزم محمد ادریس صاحب نیپالی متعلم جامعہ کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مولانا محمد طاہر صاحب عمری استاذ جامعہ نے تعلیم نسواں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کی اہمیت عوام کے سامنے واضح کی۔ مزید برآں اس سلسلہ کی رکاوٹوں کا بھی خاص طور سے تذکرہ کیا۔

اس کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب فلاحی نے بھی مولانا محمد طاہر صاحب عمری کی باتوں کی تائید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مدرسے کا ہر طرح سے تعاون کیا جائے۔ جامعۃ الفلاح کو لوگ جس طرح قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس کو بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ پیسے تو ہم دنیا جہان سے مانگ کر لا سکتے ہیں لیکن زمین یہاں کے عوام کی قربانیوں ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ امید ہے کہ حسب سابق اس سلسلہ میں جامعہ کو آپ کا تعاون آئندہ بھی حاصل رہے گا۔

جامعہ میں دوبارہ زندگی

۳ر نومبر ۱۹۸۷ء کو دوپہر بعد سے جامعہ میں چھٹی ہوگئی۔ جامعہ کے در و دیوار اپنے مکینوں سے تقریباً خالی ہوگئے۔ جامعہ کی ساری رونق اور اس کی اصل بہار دراصل اس کے طلبہ و اساتذہ سے ہے۔ یہ چند ایام دراصل جامعہ کے لئے موسم خزاں تھے۔ طلبہ و اساتذہ اپنے اپنے گھروں کو تازہ دم ہونے کے لئے روانہ ہوگئے۔ جامعہ ۱۲ر نومبر ۱۹۸۷ء کو دوبارہ کھل گیا اور جامعہ کے ایام دور ایک بار پھر کھل اٹھے۔ طلبہ و طالبات، اساتذہ و معلمات سبھی تقریباً پہنچ چکے ہیں اور

تعلیم کا آغاز ہو گیا ہے۔ امتحان کے نتائج تیاری کے آخری مرحلے میں ہیں۔

الفلاح کی تیاری

طلبہ گھروں سے لوٹنے کے بعد بڑے ہشاش بشاش دکھائی دے رہے ہیں۔ لگتا ہے اس دفعہ ان کے اندر غیر معمولی جوش و خروش ہے۔ توقع ہے اس سال وہ کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کریں گے۔ خدا انھیں بامراد کرے۔ اس وقت وہ خصوصیت سے سالانہ میگزین الفلاح کی تیاری میں منہمک ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ سالانہ اجلاس سے پہلے ہی تیار ہو جائے۔

ذمہ دارِ مطبخ جنید احمد صاحب

محترم جناب رشید الدین صاحب کے جانے کے بعد ذمہ دارِ مطبخ جناب جنید احمد صاحب مطبخ کے ساتھ ساتھ دفتر نظامت کے بھی نگراں مقرر کئے گئے ہیں۔ موصوف بحسن و خوبی اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موصوف کو خوشنویسی کا کام بھی دیا جاتا ہے اس پر وہ ماشاء اللہ مہارتِ فن کا ثبوت دیتے ہیں اور چند ہی دنوں میں غیر معمولی فرق نظر آنے لگتا ہے۔ انھوں نے ڈائننگ ٹیبل پر پلاسٹک ٹیبل کلاتھ کا بھی نظم کر دیا ہے۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں

جامعہ سلفیہ بنارس میں علامہ امام ابن تیمیہ پر ۲۲ تا ۲۴ر نومبر ۱۹۸۷ء کو ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جامعہ سے طلبہ و اساتذہ کا ایک وفد بھیجا گیا اور اس سے استفادہ کیا۔

دار المصنفین میں

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم ناظم دار المصنفین کی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے ۱۹ر نومبر ۱۹۸۷ء کو جامعہ کی بس سے کثیر تعداد میں طلبہ و اساتذہ دار المصنفین اعظم گڑھ پہنچے۔ پھر ۲۴ر نومبر ۸۷ء کو تعزیتی جلسے میں طلبہ و اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس موقع پر صدر جامعہ مولانا محمد حبیب صاحب اصلاحی نے ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ مولانا نے فرمایا "یہ حادثہ انتقال دار المصنفین ہی کے لئے نہیں تمام اداروں کے لئے ایک بڑا حادثہ ہے۔ تمام عمر جامعہ کی مرحوم نے سرپرستی فرمائی۔ بارہا جامعۃ الفلاح کو تشریف آوری سے نوازا، ہمیشہ مشورے دیتے رہے، حوصلہ افزائی فرماتے۔ وہ تعارف کے محتاج نہیں، ان کی کتابیں انشاء اللہ زندۂ جاوید رکھیں گی۔ "معارف" کے شذرات بھی اہمیت کے حامل ہوتے۔ شذرات شوق سے پڑھے جاتے۔ جب بھی میں حاضر ہوا اس بڑھاپے میں بھی انھیں مطالعہ کی میز پر پایا۔ یہ علم کی پیاس اور تڑپ دراصل ان کی متاع گراں مایہ تھی۔ موصوف نے دار المصنفین کی امانت کی پوری طرح حفاظت فرمائی اور چار چاند لگائے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ ادارہ ہمیشہ ترقی کرتا رہے

میں اپنی طرف سے اور جملہ وابستگانِ جامعہ کی طرف سے مرحوم کے اہلِ خاندان، شبلی اکادمی سب سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں۔ خدا اس کے ذمہ داروں کو توفیق و ہمت دے کہ یہ ادارہ شاہراہِ ترقی پر ہمیشہ گامزن رہے۔

تعمیرات

خدا کا فضل ہے کہ کلیۃ البنات، جامعۃ الفلاح میں تعمیر کا کام بڑی تیزی سے جاری ہے۔ دوسری منزل کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد اب پلاسٹر اور ریلنگ وغیرہ کا کام آخری مرحلہ میں ہے۔ نیز جامعہ کے ہال سے متصل دو کمروں پر مشتمل مہمان خانہ کی تکمیل ان شاء اللہ جلد ہی متوقع ہے۔

ایک اور جیپ

گزشتہ دنوں اساتذۂ جامعہ پر مشتمل وفد کے دورۂ بمبئی کے موقع پر جامعہ کے ہمدردان اور اہلِ خیر حضرات کی عنایت سے دو مستعمل بسیں طالبات کو لانے اور لے جانے کے لئے پہلے ہی آچکی ہیں جن کا تذکرہ ان ہی صفحات میں اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ اب محترم قاری قربان احمد صاحب استاذ جامعہ نے اپنے حالیہ سفرِ بمبئی کے موقع پر بعض اہلِ خیر حضرات کے تعاون سے ایک مستعمل جیپ بھی خریدی ہے جو جامعہ پہنچ چکی ہے جس سے مہمانوں کی آمد و رفت اور اساتذہ کے دوروں میں سہولت ہوگی۔

ایک ضروری اعلان

ہم یہ اطلاع دیتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں کہ شعبۂ تصنیف و تالیف جامعۃ الفلاح مولانا جلیل احسن صاحب ندوی مرحوم سابق شیخ التفسیر والادب جامعۃ الفلاح کے مقالات، تبصرے، دروسِ قرآن و حدیث اور دوسری اہم چیزیں اپنے ابنائے قدیم کے چوتھے دو سالہ اجلاس کے موقع پر شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ مولانا مرحوم کے خطوط اور دوسری کسی بھی طرح کی اہم قابلِ اشاعت چیزیں اگر کسی صاحب کے پاس ہوں تو درج ذیل پتہ پر فوراً ان کی اصل یا فوٹو اسٹیٹ کاپی بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائیں تاکہ ایسی چیزیں شاملِ کتاب ہو سکیں۔ مانگنے پر یہ امانت واپس کی جا سکتی ہے۔

والسلام

شعبۂ تصنیف و تالیف جامعۃ الفلاح